Zulfi My Friend



By: Pillo Mody

Urdu Translation
Reproduced in PDF Format

By Sani H. Panhwar

Member Sindh Council PPP

پہلا باب

پہلی ملاقات

''زکو۔ میں نیچے جارہا ہوں'' یہ وہ پہلے الفاظ تھے جن سے میں نے پہلی مرتبہ ذوالفقار علی شاہنواز بھٹو کو مخاطب کیا تھا۔ میری عمر اس وقت 10 برس کی تھی اور اس کی 9 برس کی۔ ہم دونوں بمبئی کے کیتھیڈرل بوئز سکول میں پڑھتے تھے۔ خدا کے کرم سے میں اس وقت بھی کافی موٹا تھا اور ذوالفقار ایسا لگتا تھا جیسے ہڈیوں کے کسی ڈھانچہ کو کھال میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ مگر اس کی آواز بہت تیز اور تیکھی تھی۔

زلفی سچ پوچھا جائے تو میرے خالہ زاد بھائی جہانگیر موگا سیٹھ کا دوست تھا۔ جہانگیر میری ماں کی چھوٹی بہن کالڑ کا تھا۔ میرے جتنے بھی خالہ زاد بھائی تھے ان میں جہانگیر میرے سب سے زیادہ قریب تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ شاید کچھ ہی مہینے مجھ سے چھوٹا تھا۔ اس کی بڑی بہن سیلو مجھ سے تھوڑی بڑی تھی۔ بچپن سے ہی ہم تینوں ساتھ ساتھ پہلے اور بڑے ہوئے۔ میرے حقیقی بھائی مجھ سے کافی بڑے تھے۔ کالی چار سال بڑے تھے۔ اور روسی تقریباً نو سال بڑے تھے۔

سیلو اور جہانگیر کا کمرہ کھلونوں سے بھرا رہتا تھا۔ میں ان کے پاس کھلونوں سے کھیلنے کے لیے جاتا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ مجھے کھیلنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ میری خالہ اپنے بچوں کے ساتھ بائیکلا میں رہتی تھی۔ ہفتہ کے آخیر میں وہ لوگ اکثر ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ ہم لوگ کمیالہ ہل پر رہتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد موگا سیٹھ کا کنبہ میر بن لائنس والے مکان میں آ گیا۔ سیلو نے کیتھیڈرل گرلز ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ کوئی ایک سال بعد جہانگیر بھی میرے ساتھ بوائز سکول میں پڑھنے آ گیا۔ بدقسمتی سے زلفی نے کسی سکول میں تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ نو سال کی عمر تک جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی، وہ گھر تک ہی محدود تھی۔ ہمارے پرنسپل کرنل ہیمنڈ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زلفی کو گرلز سکول میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مشورہ پر زلفی بری طرح بھڑک اٹھا تھا۔ اسے لال پیلا دیکھ کر کرنل ہیمنڈ نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا: ''شاباش، لڑکوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' اور پھر بوائز سکول میں فرسٹ سٹینڈرڈ میں اسے داخل کرلیا۔ میں اور جہانگیر تو اس سکول میں پڑھ ہی رہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ زلفی کی سکول کی زندگی کے چند سال اس قدر اچھے نہیں گزرے جس قدر گزرنے چاہئیں تھے۔ کنڈرگارٹن اور پرائمری سکول کے جو سال اس نے گنوا دیے ان کی وجہ سے وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ دوسرے طلباء کے ساتھ مساوی رہنے کے لیے اسے مسلسل کوشش کرتے رہنے پڑتا تھا۔ یہیں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ان کی دوستی گہری ہوئی۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر جانا اور پورا دن گزارنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ کھیلے۔ ایسے ہی موقعوں پر جبکہ زلفی جہانگیر کے گھر کھیل رہا ہوتا تھا۔ مجھ سے بھی اس کی ملاقات ہوجاتی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ زلفی بوائے اسکاؤٹوں کی خاکی وردی پہنا کرتا تھا۔ ہاف پینٹ پر چمڑے کی موٹی پیٹی بندھی ہوتی تھی۔ کالے ادنی موزے اور سفید جوتے ہوتے تھے۔ اس کے کندھوں پر لگے ہرے ربن یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ کیتھیڈرل سکول کے سینیئر ہاؤس کا طالب علم ہے۔ اس کی پوری پوشاک، چال ڈھال اور تیکھی خشک آواز یہ سب مجھے بہت عجیب لگتا تھا۔

میں جب اگلے پانچ برسوں کے لیے ڈہرہ دون پڑھنے کے لیے گیا تو اس وقت میرے دل و دماغ میں زلفی کی یہی تصویر تھی۔ 1945ء میں ایچ۔ ایس سی ختم کرنے کے بعد میں بمبئی لوٹا تو اس وقت بھی زلفی کیتھیڈرل سکول میں ہی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ وہ بڑا ہوگیا تھا اور سینیئر کیمبرج کے آخری سال کے امتحان کی تیاری کررہا تھا۔ اس کی آواز کچھ بہتر ہوگئی تھی۔ وہ نسبتاً لمبا ہوگیا تھا۔ بول چال، چال ڈھال بھی بہتر

ہوگئی تھی اور دیکھنے میں خوبصورت اور دلکش ہوگیا تھا۔اس میں دوسروں کے لیے مناسب احترام کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔

اس عمر میں ہماری جان پہچان بڑھنی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ پختہ دوستی میں بدل گئی۔

ہم دونوں کا پس منظر قطعی مختلف تھا۔کہا جاسکتا ہے کہ ایک دوسرے کے مخالف بھی تھا۔زلفی سندھ کے بھٹو ایک مشہور قبیلہ تھا۔اس کے مقابل دیگر خاندان تالپور اور پگوڑہ تھے۔ جہاں بھی سندھ کا سوال اٹھتا تھا یا سندھ عوام کی رائے جاننے کی ضرورت ہوتی تھی سرکار اور حکمران ہمیشہ ان لوگوں کی رائے کو جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ان کی ای ان میں سے چند گھرانوں کی امداد وتعاون حاصل کرتے تھے۔ایسا کر کے وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ سندھ عوام کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ اس قدر سخت اور روایتی جاگیردارنہ سماج میں رہتے ہوئے بھی زلفی کے والد سرشاہنواز بھٹو نے خود کو اس سماج کی پابندیوں سے آزاد کرلیا تھا۔اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے خاندان کے اعلیٰ رتبے کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے برطانوی ہندوستانی سماج میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔جو بھی ہو۔یہ حقیقت ہے کہ زلفی کے والد نے برطانوی ہندوستان میں سندھ کے نمائندہ کی حیثیت سے ایک اہم مستقل مقام حاصل کرلیا تھا۔انہیں کی وجہ سے بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ علیحدہ ہوا۔کافی عرصہ تک وہ کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر رہے۔غیر سرکاری عہدے بھی انہوں نے سنبھالے۔وہ بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔لاڑکانہ کے ضلعی کوآپریٹوں بینک کے چیئرمین رہے۔بمبئی کی صوبہ کمیٹی کے صدر بھی بنے۔اس کمیٹی نے انڈین اسٹیٹیوٹری کمیشن کا ساتھ دیا تھا۔سرشاہنواز پہلے ایسے غیر سرکاری شخص تھے جو لاڑکانہ ضلع بورڈ کے چیئرمین منتخب کیے گیے تھے۔وہ سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے تھے۔

1931ء میں سرشاہنواز میرے والد کے ساتھ ہندوستان کے متعلق ہوئی گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے انگلینڈ گئے۔وہاں انہوں نے سندھیوں کے لیے الگ اسٹیٹ کا مطالبہ کیا۔1934ء میں انہیں بمبئی حکومت کا وزیر بنایا گیا۔سندھ کی تقسیم کے بعد وہ سندھ کے خاص میئر کے عہدے پر تب تک کام کرتے رہے جب تک 1937ء کے انتخابات کے بعد عوام کی من پسند وزارت قائم نہ ہوگئی۔سرشاہنواز نے یونائیٹڈ پارٹی بنائی اور 60 میں سے 18 سیٹوں پر فتح حاصل کی۔لیکن وہ خود ناکام رہے۔یہ ان کی ایک خاص بات تھی۔انہوں نے اپنا تمام وقت اور سرمایہ اپنے ساتھیوں کو الیکشن میں کامیاب بنانے میں صرف کردیا اور اپنے حلقہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔کئی برس کے بعد زلفی نے بھی بہت وسیع پیمانہ پر اسی طرح کی بات دہرائی۔اس کا دائرہ بہت ہی وسیع یعنی پورا مغربی پاکستان تھا۔لیکن اتفاق سے زلفی کو چھ سیٹوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔جب انہیں وزارت بنانے میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو سرشاہنواز بمبئی آگئے اور سندھ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین ہوگئے۔

1947ء میں وہ جوناگڑھ چلے گئے جو ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔وہ وہاں کے دیوان بن گئے۔جناح کے کہنے پر انہوں نے نواب جوناگڑھ کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے کے دستاویز پر دستخط کردیں۔تقسیم ہند کے موقعہ پر جو تلخی پیدا ہوئی اس کی کچھ وجہ سرشاہنواز کی یہ کاروائی بھی تھی۔ان دنوں ٹیکس بہت ہی معمولی تھے۔یوں بھی بھٹو گھرانہ کافی دولت مند گھرانہ تھا۔زمینداروں کو تو قریب قریب کوئی ٹیکس دینا ہی نہیں پڑتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بھٹو گھرانے کے پاس کافی دولت جمع ہوگئی۔لیکن یہ روپیہ ہمیشہ ہی سمجھ داری سے خرچ نہیں کیا گیا۔زلفی کے والد کچھ سنکی تھے اور ساتھ ہی نہایت رنگین مزاج بھی تھے۔بمبئی کے سماج میں ان کے متعلق بہت سے لطیفے مشہور تھے۔

دوسری طرف میرے والد کی پرورش جس گھرانے میں ہوئی اس کے ماحول میں رنگینی اور کیف کا نام ونشان تک نہ تھا۔ہمارے گھرانے کا رہن سہن اور اصول وکٹوریہ کے زمانے کے سماج جیسے تھے۔ہر معاملے پر نہایت محدود انداز میں اور گھرانے کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر غور کیا جاتا تھا۔میرے والد کا پختہ یقین تھا کہ ایک دن وہ بہت بڑے آدمی بنیں گے ان کے خیالات بہت بلند تھے۔وہ نہایت حاضر جواب

تھےاور اگر مذاق میں ان پر کبھی چھینٹا کشی ہوجاتی تھی تو وہ ہنس کر برداشت کر لیتے تھے۔ روپیہ پیسہ اور سرمایہ میں ان کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جن دنوں ان کی آمدنی بہت کافی تھی ان دنوں بھی زیادہ دولت جمع کرنے کا لالچ انہیں نہیں ہوااور نہ روپیہ جمع کرنے کا خیال ہی انہوں نے اپنے دل ودماغ میں آنے دیا۔

وہ دن قربانی کے دن تھے۔ ملک کے لیے روپیہ پیسہ ہی نہیں جسم و جان بھی قربان کر دینے کے دن اور ساتھ ہی کچھ کر گزرنے کے دن۔ ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے لیے فیصلہ کن جنگ شروع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مہاتما گاندگی قحط اور مصیبتوں سے پامال دیہاتوں میں کانگریس کی بنیادیں مضبوط کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔ ادھر ہندوستان کے قانونی، ادبی اور تکنیکی حلقوں میں ذاتی بل بوتے پر آگے بڑھنے والے ذہین وسمجھدار رہنما ابھر رہے تھے۔ ان رہنماؤں کے ذریعے ہندوستان یہ ثابت کر رہا تھا کہ ہندوستانیوں میں وہ قابلیت اور سوجھ بوجھ ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشے میں بہترین ڈھنگ سے رہنمائی کر سکتے ہیں۔ میرے والد بھی ان میں سے ایک تھے۔

1980ء میں جب میرے والد کی عمر 27 برس کی تھی، انہیں اپنے ایک مضمون پر لیڈ لا پرائز ملا تھا۔ مضمونوں کے اس مقابلہ کا موضوع تھا ''ہندوستان کا سیاسی مستقبل۔'' اس مقابلہ کا اہتمام ہاؤس آف کامنز کے لیبر پارٹی کے ایک ممبر نے کیا تھا۔ اس مقابلہ میں اول آنے والے کو دو ہزار کا انعام دیا جاتا تھا۔ ان دنوں یہ رقم بہت بڑی مانی جاتی تھی۔ میرے والد نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا تھا کہ ہندوستانیوں میں اپنی حکومت اور اپنی سرکار چلانے کی قابلیت ہے اور انہیں اپنی سرکار خود چلانے کے حقوق ملنے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں پیشین گوئی کی کہ پچاس سالوں میں ہندوستان مضبوط اور طاقت ور ملک بن جائے گا اور اس صدی کے آخیر تک آزاد ہو جائے گا۔ اپنے دور حیات میں ہی انہوں نے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہندوستانیوں میں رہنمائی کی قابلیت اور صلاحیت ہے۔ وہ اپنی سرکار خود چلا سکتے ہیں۔ ان کی یہ زبردست خواہش تھی کہ سبھی دفتروں میں ہندوستانی کام کریں۔ جب وہ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ تب بھی انہوں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی۔ اس وجہ سے لارڈ لنلتھگو کے ساتھ ان کی کبھی نہیں بنی۔

ادب سے قانون اور پھر بیوپار اور پبلک سیکٹر میں آکر میرے والد نے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی جس کے ارادوں میں بلندی کے ساتھ پختگی بھی تھی اور جس کسی بھی حلقہ میں اس نے قدم رکھے اس حلقہ کی رہنمائی کرنے کی قابلیت اور صلاحیت بھی تھی۔ سوتی کپڑے کے کاروبار کو سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن میرے والد نے نہایت ہوشیاری سے ان مشکلات پر قابو پالیا۔ غیر ملکی حکمران کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اپنی سوجھ بوجھ، ذہانت اور رہنمائی کی قابلیت وصلاحیت سے حالات کو خوشگوار بنا دیا۔

بمبئی میونسپل کونسل میں سر فیروز شاہ مہتا نے عوام کی جو خدمت کی، انہی کے نقش قدم پر چل کر میرے والد بھی عوام کی خدمت میں جٹ گئے۔ انہوں نے 20 برس تک عوام کی دل و جان اور لگن کے ساتھ خدمت کی۔ اس کے بعد انہیں ''مل اونرایسوسی ایشن'' کا صدر بنایا گیا۔ اسی وجہ سے وہ سینٹرل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے دہلی پہنچے۔ وہاں انہوں نے ہر اہم لیڈر کی پیروی کی۔ حالانکہ اس سے انہیں نقصان ہی پہنچا۔ 1935ء میں وہ ٹاٹا کے یہاں چلے گئے اور آخر تک وہیں رہے۔ ہاں بیچ میں دو مرتبہ چند سالوں کے لیے انہوں نے سرکاری عہدوں پر کام کیا۔ ایک مرتبہ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے سپلائی ممبر کی حیثیت سے انہیں نامزد کیا گیا اور دوسری مرتبہ اتر پردیش کا گورنر بنایا گیا۔

ان کی زندگی کا مقصود روپیہ کمانا نہیں تھا۔ انہوں نے لکھا ہے: روپیہ کمانے کا خیال دل میں آنے سے بہت پہلے سے ہی میں نے مختلف جماعتوں کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع ردی تھی۔ سبھی طرح کے مسئلوں پر میں غور کیا کرتا تھا۔ رہائی پانے والے قیدیوں سے لے کر ان بچوں تک کے مسئلے میرے ذہن میں گھوما کرتے تھے، جن کے والدین انہیں لاوارث چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد کر کے مجھے

حقیقی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

وہ نہایت آزاد خیال تھے۔اسی لیے کسی کے بتائے ہوئے راستے کو نہ اپنا سکے۔انہوں نے برطانوی حکومت سے لوہا لیا۔وہ گاندھی جی کی تعریف کرتے تھے۔لیکن ضرورت پڑنے پر ان پر تنقید کرنے یا انہیں للکارنے تک سے منہ نہیں موڑتے تھے۔

وہ زندگی بھر اپنے اصولوں کے پابند رہے اور جہاں لڑنے کی ضرورت پیش آئی جدوجہد سے کبھی منہ نہ موڑا۔ان کی سوانح عمری کے مصنف ڈی۔آرمن کیکر لکھتے ہیں۔

''مودی یا تو خود مشکلوں اور مصیبتوں کو حل کرنے میں جٹے رہتے تھے یا پھر مشکلیں اور مصیبتیں ان کے دامن گیر رہتی تھیں''۔اسی وجہ سے اپنے زمانے کے بڑے سے بڑے لوگوں کے ساتھ ان کی ٹکر ہو جاتی تھی۔ان میں گاندھی، جناح، نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر، ٹریڈ یونینوں کے لیڈر اور وائسرائے سبھی شامل تھے۔ہندوستان میں خود پر شک کرنے کی روایت کا جو جنگل ہے وہ اس میں سے اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ سے تعمیر کی گئی رہ سے گذرے، نہایت کامیابی اور فتح کے ساتھ۔ہم یعنی میں اور زلفی اس جدوجہد کے سایوں تلے پلے اور پروان چڑھے بڑے بڑے بحث مباحثوں کو خود میں سموتے ہوئے اور اپنے زمانے کی عظیم شخصیتوں کی قربت حاصل کرتے ہوئے ہم بڑے ہوتے گئے۔ان عظیم اشخاص نے اپنی شخصیت کے اثر سے ایک نئی تاریخ کی ابتداء کی۔ان جیسے لوگ آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں نہیں ملتے۔

اس طرح کے پس منظر کا میرے خیالات پر ایک گہرا اثر پڑا۔میری شخصیت پر بھی اثر پڑا۔اس سے مجھے اپنے نظریہ کو نرم اور وسیع بنانے میں مدد ملی۔میرے سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے طریقے اور میرے نظریہ پر زلفی کی شخصیت کا بھی اثر پڑا۔دونوں باتوں نے مل کر مجھ پر اثر ڈالا۔

1937ء میں جب میں کیتھیڈرل اور جان کانن ہائی سکول کی چوڑی کاٹھ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔تو میں نے ایک دبلے پتلے لڑکے کو اپنے پیچھے سے آگے جانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے روکتے ہوئے کہا:''رکو، میں نیچے جا رہا ہوں۔'' میری جسامت اور میری گرجدار آواز کو سن کر اور نو سال کی عمر میں بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ کبھی کبھی بہادری دکھانے کے بجائے اپنی مونچھیں نیچی کر لینا ہوشیاری ہوتی ہے۔ذوالفقار علی رک گیا اور چند لمحے کے انتظار کے بعد میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔

دوسرا باب

اپنے متعلق فیصلے کے چند سال

بمبئی کا جو ماحول تھا اسے دیکھتے ہوئے ڈہرادون سکول کی میری تعلیم نسبتاً بلند پایہ تھی۔ اس تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد جب میں بمبئی واپس آیا تو مجھے بمبئی نہایت ویران، اجاڑ اور بے کیف نظر آیا۔ میں کچھ دبا دبا سا محسوس کرتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ تنہائی مجھے بری طرح پریشان کر رہی ہے۔ تمام دنیا سے الگ جب کسی کو پبلک سکول میں پانچ سال گذارنے پڑتے ہیں تو وہاں بہت سے دوست بن جاتے ہیں۔ لیکن سکول چھوڑنے کے بعد باہری دنیا کی زندگی عجیب سی نظر آتی ہے۔ پبلک سکول کی زندگی ایک محفوظ ماحول کی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن باہری دنیا وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ باہری دنیا کا تہذیبی پس منظر مختلف ہوتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ باہری دنیا کی زندگی میں اسے ڈسپلن نظر نہیں آتا۔ پبلک سکول میں صبح کی گھنٹی بجنے پر جاگنے سے لے کر رات کو بجلی بجھا دیے جانے کے بعد سونے تک دن کے ہر لمحہ کا حساب ہوتا ہے۔ یہ طے ہوتا ہے کہ کب کیا کرنا ہوگا۔ طے شدہ پروگرام ذرا سا بھی ادھر ادھر ہو جانے پر سزا ملتی ہے۔ اس سزا سے بچنے کے لیے دل میں ڈسپلن کے لیے عزت واحترام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حالانکہ سال میں دو مرتبہ ہم لوگوں کو گھر آنے کے موقعے ملتے تھے لیکن اس کا زیادہ تر وقت کنبہ کے لوگوں سے ملنے میں ہی گذر جاتا تھا۔ ہندوستان میں کنبہ کے ممبروں کی تعداد کافی ہوتی ہے۔ میں ہر چاچا، چاچی، ماما، مامی اور خالہ، خالو سے ملنے جاتا تھا۔ کنبہ کے قاعدہ اور طرز زندگی کے مطابق کچھ مذہبی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ تعلیم سکول میں نہیں دی جاتی تھی۔ گھر آنے پر کبھی کبھی مندر جاتا تھا اور بھگوان سے دعا کیا کرتا تھا کہ مجھے ایسی نیک سمجھ دے کہ جس سے مجھے اپنی کسی کمی یا غلطی کے لیے یا سکول کے سکی اصول کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے سزا نہ ملے یا قصوروار ہونے پر میں اس سزا سے بچ جاؤں۔ کچھ وقت سکول کے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت میں نکل جایا کرتا تھا۔

والد محترم کو ہند سرکار میں عہدہ مل جانے پر ہم کو تقریباً 18 مہینے کے لیے دہلی آنا پڑا۔ انہیں محکمہ سپلائی میں ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ اسلیے مجھے اپنی چھٹیاں دہلی میں گذارنی پڑیں اور میرا رشتہ بمبئی سے ٹوٹ گیا۔

سکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب میں بالکل فارغ رہنے لگا تو یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اس وقت کا کیا استعمال کیا جائے۔ وقت گذارنا ایک مصیبت بن گئی۔ اس لیے کہ بچپن میں ہی اپنے دوستوں سے میرے تعلقات ختم ہو گئے تھے اور مین نے نئے دوست نہیں بنائے تھے۔ جو بہن بھی تھی ے دو خالہ زاد بھائی اور . جہانگیر اور سیلو تک ہی محدود ۔

ان دنوں میں روزانہ ہی ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ڈہرہ دون سکول میں رہنے کی وجہ سے میری یہ عادت ہو گئی تھی کہ میں روزانہ ورزش کیا کروں۔ اس لیے میں نے ولنگڈن اسپورٹس کلب میں ٹینس، بیڈمنٹن اور اسکواش کھیلنا جاری رکھا۔ میں سوئمنگ پول کا بھی استعمال کرتا اور کبھی کبھی اس کے کنارے کلب میں بیٹھا رہتا۔ باقی وقت گھر پر موسیقی سننے اور فلاسفی اور تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔

بچپن میں جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے مجھے یاد ہے کہ میرے والدین ایک خواب دیکھا کرتے تھے۔ اپنا ایک گھر بنانے کا خواب ...اور آخر انہوں نے یہ گھر بنا ہی لیا۔ بچپن سے مجھے فن تعمیر میں دلچسپی تھی۔ میں ادھر ادھر مکانوں کی تعمیر کے متعلق نقشے پڑے دیکھتا۔ انہیں دیکھ کر میں نے بھی نقشے بنانے شروع کر دیئے۔ اپنے مکان کی تعمیر کے دوران میں نے اس کے ڈیزائن اور تعمیر وغیرہ کی تفصیلات میں گہری دلچسپی دکھائی تھی۔ میں نے اپنا کام اپنے یہاں کے ماہر تعمیر کو بھی دکھایا تھا۔ ان کا نام جہانگیر بلمورتھا۔ وہ نہایت صاف ستھرے اور ذہین تھے۔ چند دن پہلے ہی انگلینڈ سے واپس آئے تھے۔ ان سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے ماہر تعمیر بننے کا تہیہ کر لیا۔

میری ماں کا خیال تھا کہ وہ فن تعمیر کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ان کے مزاج میں عمل کو دخل زیادہ ہے۔ وہ اب بھی مجھے اس سلسلے میں صلاح مشورہ دیتی رہتی ہیں۔ مکان کی تعمیر کے دوران مکان کے ڈیزائن کے بارے میں برابر دخل انداز ہوتی ہیں اور ہمارے ماہر تعمیر کو انہوں نے اسقدر پریشان کر ڈالا کہ وہ گھبرا کر بیمار پڑ گیا۔ ہم لوگوں نے مکان کی تعمیر کے لیے ایک مشیر بھی رکھا۔ میں نے بعد میں سنا کہ اس نے بھی خودکشی کر لی۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ بات کس حد تک سچ ہے۔ ان دنوں میں نے یہ سیکھا کہ گاہکوں کے ساتھ کس حد تک سختی سے پیش آنا چاہیے۔

جو بھی ہو میں نے ماہر تعمیر کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لیے یہ قدرتی تھا کہ اس فیصؒ ے کے بعد میں جے۔ جے سکول آف آرٹ میں داخلہ پانے کی خواہش ظاہر کرتا۔ کیونکہ صرف یہی ایک ایسا سکول تھا جس میں ان دنوں فن تعمیر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جنگ جاری تھی اس لیے اس کے بند ہو جانے تک کسی دوسرے ملک میں جانے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ لیکن کالج سال کے درمیان نہیں کھلتے۔ اس لیے مجھے 6-7 مہینے کی چھٹیاں گذارنی پڑیں۔

اسی دوران میں اور زلفی پھر قریب آئے۔ اس نے وقت گذارنے میں میرا کافی ساتھ دیا۔

زلفی ہمیشہ ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا۔ کسی بھی نئی پلاننگ کے لیے تیار رہتا تھا۔ کسی کا بھی مذاق اڑانے میں اسے کوئی جھجک نہ ہوتی تھی اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ وہ ان دنوں ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا۔ چھٹیوں میں وہ ہمارے ساتھ سارا دن رہتا۔ ہم لوگ صبح ساڑھے سات بجے ٹینس کھیلتے۔ اس کے بعد کچھ دیر بیڈمنٹن اور اسکواش چلتا پھر تیرنے کا پروگرام شروع ہو جاتا۔ تب تک دن کا ایک بج جاتا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہم گھر آ جاتے۔ کبھی کبھی زلفی دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھا لیتا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم لوگ کسی سینما گھر جانے کی تیاری کرنے لگتے۔ فلم دیکھ کر ہم سیدھے گھر آ جاتے تھے۔ کیونکہ میرے والد کا اصرار تھا کہ رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے کھا لینا چاہیے۔ رت کے کھانے کے بعد زلفی ہمارے مکان کے سامنے سے گذرتا اور پھاٹک پر سیٹی بجاتا۔ سیٹی سنتے ہی میں گھر سے باہر آ کر اس کے ساتھ ہو لیتا

اور ہم لوگ آدھی رات تک گھومتے رہتے۔اس کے بعد گھر آ کر سو جاتے۔ان دنوں زلفی کے گھر والے کار مائیکل روڈ پر کھیا مینشن مین رہتے تھے۔اس کا گھر سڑک کے اس پار ہمارے گھر کے ٹھیک سامنے تھا۔ان دنوں ہم ہر فکر سے آزاد تھے اور دن بڑے مزے میں گذر رہے تھے۔ان دنوں ہم دنیا کے مسئلوں پر بحث کرتے، شراکتیں بناتے اور بگاڑتے۔طرح طرح کے پیشے اپنانے کے بارے میں سوچتے اور پھر اپنے مشورے رد کر دیتے۔عام طور پر ہم اس وقت کی سیاست پر بحث کرتے تھے۔ان دنوں ہندوستان لڑکھڑاتے قدموں سے آزادی کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس لیے سیاسی بحث میں جوش وخروش کافی رہتا تھا۔جب کالج کھل گئے تو ہمیں گھومنے پھرنے اور سیاست پر بحث کرنے کے لیے وقت کم ملنے لگا۔لیکن ہم اس کمی کو ہفتہ کے آخر میں اور دوسری تعطیلوں میں پورا کر لیتے تھے۔ایک مرتبہ زلفی اور میں اپنے دوست رام للکوانی کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم کپڑے کی دکان کھولیں۔لیکن دوسرے منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی ہوا میں ہی رہ گیا۔

ولنگڈن کلب میں ہم دوستوں کی پارٹی کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔جو دوسرے لوگ شامل ہوئے ان میں رشید حبیب بھی تھا۔اب وہ پاکستان میں ہے اور حبیب بینک گھرانے کا ایک ممبر ہے۔جنگو ریڈی منی، منوشر وڈکر، (جو عورتوں کی بیماریوں کے مشہور ماہر ڈاکٹر شروڈکر کا بیٹا تھا ،مستان طیب جی، دھرم جیلو، ہورمس جی اور عارف کریم بھائی کے علاوہ ہم لوگوں کی ملاقات اور دوستی اینجلس فیلی ست فنستر آرمسٹرانگ سے بھی ہوئی۔جس کے والدین اینگلو فرنچ تھے۔سیلو، جہانگیر موگا سیٹھ اور رام للوانی تو ہمارے ساتھ تھے ہی۔

کوئی بھی کھیل یا ہنسی مذاق ہو زلفی ہمیشہ میری تائید کرتا تھا۔اس لیے جب کبھی میں اس کا ساتھ نہ دیتا تو اسے بہت افسوس ہوتا۔اکثر اور زلفی اکیلے رہ جاتے۔اس وقت وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ مختلف موضوعات پر سلسلہ وار گفتگو شروع کرتا۔طرح طرح کے سوالات کرتا۔معلومات حاصل کرتا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو ذہن نشین کر لیتا۔ ہمارے موضوع تاریخ، ادب، سیاست، فلسفہ، موسیقی اور اقتصادیات جیسے ہوتے تھے۔میں ان کتابوں کے بارے مین اسے بتاتا کہ اسے کون کونسی کتابوں کا مطالع کرنا چاہیے۔ہم لوگ مختلف ممالک اور ان میں رہنے والوں کے متعلق باتیں کرتے اور اپنے ذاتی تجربے ایک دوسرے کو سناتے۔لطیفے بازی بھی چلتی رہتی۔

زلفی بے حد ذہین تھا۔اس کی یادداشت بہت اچھی تھی اور اس میں معلومات حاصل کرنے کی لامحدود پیاس تھی۔اس کے باوجود وہ دسمبر 1945ء میں ہوئے سینیئر کیمبرج کے امتحان میں کیسے فیل ہو گیا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔جنگ کا ہنگامی دور تھا۔اس لیے امتحان کا نتیجہ 1946 کے بیچ میں سنایا گیا تھا۔شاید شروع میں زلفی کی تعلیم ٹھیک طریقے سے نہیں ہوئی تھی۔اسی وجہ سے وہ پڑھنے کی ٹھیک اور صحیح تکنیک نہیں سمجھ پایا تھا۔اس میں ڈسپلن بھی اس حد تک نہیں آپایا تھا جو پڑھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔انہی دنوں زلفی کی چھوٹی بہن کا انتقال ہو گیا۔زلفی اسے بہت پیار کرتا تھا۔اس لیے اس کا دل پڑھائی کی طرف سے اچٹ جانا قدرتی تھا۔فیل ہو جانے کے بعد زلفی نے ناامید ہونے کے بجائے اور زوروں سے پڑھائی شروع کر دی۔تقریباً چھ مہینے تک وہ کسی سے نہیں ملا جلا۔ہر وقت امتحان کی تیاری میں جٹا رہا اور آخر دسمبر 1946 میں اس نے امتحان پاس کر ہی لیا۔

انہی دنوں زلفی کا عشق اور رومانس شروع ہوا۔وہ افلاطونی تھا لیکن زلفی کے لیے افلاطونی عشق زندگی کا مقصود بن گیا۔وہ اس لڑکی کو دل وجان سے محبت کرنے لگا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ اس خیال کے دام میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے۔لیکن وہ دکھی تھا۔کیونکہ اس لڑکی کے گھر والوں نے اس کے زلفی سے ملنے پر پابندی لگا دی تھی اور وہ اس سے پیار بھری باتیں نہیں کر سکتی تھی۔ زلفی اس لڑکی سے چھپ کر ملنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔افسوسناک بات تو یہ تھی کہ زلفی اس لڑکی کو دل وجان سے پیار کرتا تھا لیکن اس لڑکی کے گھر والے زلفی کے بے حد خلاف تھے۔زلفی تڑپتا رہتا۔دنیاداری کا کافی تجربہ ہو جانے کے بعد بھی زلفی اس لڑکی کو بھول نہیں پایا۔

میں نے ڈہرہ دون سکول میں پانچ سال تک کرکٹ کھیلا تھا۔ وہاں کرکٹ لازمی تھا۔ پھر بھی کھیل میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن بمبئی آنے پر زلفی کی وجہ سے اس کھیل میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ کرکٹ سے زلفی کو بے حد لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے اس وقت کے کرکٹ کے مشہور کھلاڑیوں سے زلفی کا تعارف ہوا۔ ان میں سے کئی کھلاڑیوں کا زلفی نے مجھ سے بھی تعارف کرایا اور اس طرح کرکٹ میں میری دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہم لوگ کھیل دیکھنے جاتے۔ جنگ کے دوران پانچ سال تک ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان کوئی ٹیسٹ میچ نہیں ہوسکا۔ اس کے بعد جب ٹیسٹ میچ شروع ہوئے تو اور لوگوں کی طرح ہم بھی یہ میچ دیکھنے لگے۔

ہندوستانی کرکٹ کا یہ سنہرا دور تھا۔ ان دنوں کے عظیم کھلاڑیوں میں وے مرچنٹ، ہزارے، مشتاق علی، امرناتھ، مانکڈ، حفیظ محمد، روسی مودی، گل محمد، کرشن چندو وغیرہ تھے۔ نواب پٹودی کا شمار بھی کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں کیا جاتا تھا۔ وہ انگلینڈ میں ٹیسٹ میچ کے لیے گئی ہندوستانی ٹیم کے کپتان بھی بنائے گئے تھے۔ مشتاق علی کھیلکے اپنے مخصوص انداز، تیزی اور رن بنانے کی اپنی صلاحیت اور اپنے دھاک بٹھا دینے والے کھیل کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ اتفاق سے مشتاق علی کی زلفی کے ساتھ گہری دوستی تھی۔

ٹیسٹ میچ کے سلسلے میں پہلے جو پریکٹس میچ ہوئے، ان کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ زلفی، مشتاق علی اور میں تینوں کرکٹ کلب انڈیا میں کھیل دیکھ رہے تھے۔ تبھی حفیظ محمد یا روسی (مودی نے دونوں میں سے کون تھا یہ مجھے یاد نہیں) چھکا مارا۔ ہم لوگوں نے خوشی کے مارے خوب زور زور سے تالیاں بجانی شروع کردیں۔ تبھی مشتاق علی نے کہا۔ ''ذرا ٹھہراو۔ کچھ دیر بعد میں اتنی زور کا ہٹ ماروں گا کہ گیند یہاں ٹھیک تمہارے سامنے آکر گرے گی۔'' ہم جس مقام پر بیٹھے ہوئے تھے وہ مقام اس مقام سے کافی اونچائی پر تھا جہاں گیند آکر گری تھی۔ تھوڑی دیر بعد مشتاق علی بیٹ لے کر کھیل کے میدان میں اترے اور انہوں نے کچھ بہت ہی شاندار ہٹ لگا کر تھوڑے وقت میں ہی 96 رن بنالیے۔ اس کے بعد انہوں نے ذرا آگے بڑھ کر اتنی زور کا ہٹ لگایا کہ گیند عین اس جگہ آکر گری جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر سارے اسٹیڈیم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ انہوں نے ایک چھکا لگا کر اپنی سنچری بنالی تھی۔ ہم لوگ خوشی سے پاگلوں کی طرح زور زور سے چلا رہے تھے اور مشتاق کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ انہوں نے پھر اگلی گیند پر پہلے والا ہٹ لگانے کی کوشش کی لیکن چوک گیے اور آوٹ ہوگئے۔ تو ایسا کھیل ہوتا تھا مشتاق علی کا۔

1944-43ء میں مشتاق علی پینٹاگلر کرکٹ ٹورنامنٹ کے لیے بمبئی آئے تھے ان دنوں وہ کرکٹ کی دنای کے ہیرو تھے۔ ہر طالب علم ان کی پرستش کرتا تھا اور ان کی مقبولیت اور شہرت کرکٹ کھلاڑیوں کے لیے باعث حسد تھی۔

ایک روز بہت سے طلبہ مشتاق سے ملنے کرکٹ کلب میں ان کے کمرہ میں گئے۔ ان میں زلفی اور اس کا دوست عمر قریشی بھی تھا۔ وہیں سے زلفی کا مشتاق سے میل جول شروع ہوا۔ عمر قریشی بعد میں پاکستان چلا گیا اور پاکستان کا سب سے اعلیٰ کرکٹ کمنٹیٹر مانا جاتا ہے۔

چند دنوں بعد زلفی پھر مشتاق سے ملنے گیا اور اس نے مشتاق کو اپنے گھر چائے کی دعوت دی۔ مشتاق نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کرلی۔ زلفی کے گھر مشتاق کے آنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ زلفی نے مشتاق کا اپنے والد، اپنی ماں اور بہنوں سے تعارف کرایا اور اس طرح مشتاق اور زلفی کے گھرانوں کے درمیان قریبی تعلقات کی ابتدا ہوئی۔

مشتاق اندور کے رہنے والے تھے۔ بھٹو گھرانے سے دوستی ہوجانے پر انہیں بمبئی میں اپنا ایک اور گھر مل گیا۔ زلفی کی ماں اور بہنوں کا مذہب پر بے حد اعتقاد تھا جس سے مشتاق بیحد متاثر ہوا۔

ان دنوں زلفی کی عمر 16 سال کی تھی اور مشتاق کی عمر اس سے دس سال زاید تھی۔ زلفی مشتاق کی کرکٹ کا دلی مداح تھا۔ دوستوں کے

درمیان جب بھی موقعہ ملتا۔ زلفی کھلے دل سے مشتاق کی تعریف کرتا۔ مشتاق کو دیا ہے کہ زلفی اس وقت بھی بے حد اسمارٹ تھا۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتا تھا۔ کرکٹ، شاندار لباس، شاندار فلموں اور عمدہ کھانوں کا شوقین تھا۔ لیکن مزاج بیحد نازک۔ چھوئی موئی کی طرح۔ بہت جلد ناراض ہو جاتا، غصے سے چلانے لگتا اور جلد ہی رونے سسکنے لگتا۔ یہ بات مشتاق کو خوب اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن جیسی کہ زلفی کی عادت ہے اپنی اس طرح کی لمحہ بھر کی ناراضگی کو اس نے اپنی دوستی میں کبھی رکاوٹ بننے نہیں دیا۔

آہستہ آہستہ چند سالوں مین مشتاق اور بھٹو گھرانہ ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ گئے۔ مشتاق کو جب بھی بمبئی آنے کا موقعہ ملتا بھٹو گھرانے میں ہی ٹھہرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد زلفی کے دوستوں میں ایک اور ٹیسٹ کرکٹر گل محمد کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح کرکٹ کے حلقوں میں یہ تینوں قریبی اور گہرے دوست بن گئے۔ کرکٹ سے لگاؤ ہونے کی وجہ سے زلفی کھلے دل سے سبھی کرکٹ کھلاڑیوں کے کھلانے پلانے پر خرچ کرتا تھا۔ انہیں ڈنر دیتا تھا۔ پکنک پر لے جاتا تھا۔

مشتاق کا خیال تھا کہ زلفی میں کرکٹ کھیلنے کی صلاحیت ہے۔ اگر وہ پریکٹس کرتا رہتا تو بہت اچھا کھلاڑی بن سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے ان دنوں زلفی سیاسی باتیں نہیں کیا کرتا تھا۔

1946ء میں مشتاق کو بمبئی آنا پڑا۔ اس کے بعد کرکٹ کے کھلاڑیوں کے ساتھ وہ رانجی ٹرافی میچ کھیلنے گیا جو ہولکر اور بنگال کے درمیان ہوا تھا۔ تب زلفی کو مشتاق، سروے اور نمبالکر کے ساتھ سفر کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ چاروں کلکتہ میں کلیان سین کے گھر ٹھہرے۔ ان کے پاس کچھ وقت تھا۔ اس لیے وہ چند دنوں کے لیے ہزاری باغ بھی گئے۔ وہاں ان لوگوں نے ایک میچ کھیلا جس میں زلفی کو بھی شامل کیا گیا۔

اگلے سال مشتاق کو پھر بمبئی آنا پڑا۔ ہمیشہ کی طرح مشتاق زلفی کے گھر میں ٹھہرے لیکن شوٹ نزجی کی ایک گیند مشتاق کے لگ گئی۔ فوراً پلاسٹر کر دیا گیا اور مشتاق کو کرکٹ کلب میں ہی روک لیا گیا۔ لیکن رات کو مشتاق کا درد اتنا بڑھ گیا کہ آدھی رات کو اس نے زلفی کو ٹیلیفون کیا اور اسے کلب بلایا۔ جب زلفی کرکٹ کلب پہنچا تو مشتاق نے اس سے کہا کہ وہ اسے اپنے گھر لے چلے۔ زلفی اسے گھر لے گیا۔ گھر پہنچ کر دونوں نے قینچی سے پلاسٹر کاٹا۔ تب کہیں جا کر مشتاق آرام سے رات گذار سکا۔

زلفی اور اس کے گھر والوں نے مشتاق کو کئی مرتبہ تحفے دیے۔ ایک مرتبہ دونوں نے ایک دوسرے کو گھڑیاں بھی دیں۔ ایک مرتبہ جب ہندوستانی ٹیم انگلینڈ جا رہی تھی تو زلفی کے گھر والوں نے مشتاق اور دوسرے کھلاڑیوں کو نئے سوٹ تحفے میں دیے۔ مشتاق کو یہ بات آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے۔

اس کے کچھ دن بعد زلفی کے والد دیوان بن کر جونا گڑھ چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی زلفی اور مشتاق کا رابطہ ختم ہو گیا۔ ہاں کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے کو خط ضرور لکھتے رہتے تھے۔

1955-54ء میں مشتاق اور زلفی کی ملاقات پھر ہوئی۔ مشتاق کراچی کے سیلاب زدہ لوگوں کے لیے کھیلے جانے والے کرکٹ میچ میں کھیلنے کے لیے کراچی گئے تھے۔ اسی مقصد سے آسٹریلیا کے کیتھ ملر بھی پاکستان پہنچے تھے۔ زلفی اور اس کے گھر والوں نے ہمیشہ کی طرح مشتاق کے ساتھ پرخلوص برتاء کیا۔ لیکن مشتاق نے دیکھا کہ زلفی کے خیالات میں کچھ تبدیلی آ گئی تھی۔ زلفی کا ذہنی موضوع کرکٹ نہ رہ کر سیاست بن گیا تھا۔

میرے امریکہ چلے جانے کے بعد مشتاق سے میرا رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ ان دنوں کے بعد کبھی کبھی یہاں وہاں ملنے کے علاوہ ہم لوگ لمبے عرصہ تک نہیں مل پائے۔ لیکن جب بھی کرکٹ کی بات آتی ہے مشتاق کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن صرف کرکٹ ہی ہم لوگوں کی دلچسپی کا

تنہا موضوع نہیں تھا۔

1945ء میں جہانگیر موگا سیٹھ اور زلفی چھٹیاں گذارنے مسوری گئے چند دنوں کے لیے میں نے بھی ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ مسوری جانا مجھے بہت اچھا لگا۔ کیونکہ وہاں جانے پر چند دن اپنے پرانے ڈہرہ دون سکول میں رہنے کا موقعہ بھی مل رہا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے ہی اسکول چھوڑا تھا اور میرے بہت سے دوست ابھی اسکول میں ہی قید تھے۔ ہم تینوں چارل ذیل ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ہم تینوں کی وجہ سے ہوٹل کو کافی نقصان پہنچا ہوگا۔ ہم لوگ خوب ڈٹ کر کھانا تو کھاتے ہی تھے ساتھ ہی پڈنگ کی ڈش جب بھی زلفی کے سامنے آتری تھی تو وہ ساری کی ساری پڈنگ اپنی پلیٹ میں ڈال لیتا تھا۔ جہانگیر بھی دوسری ڈش کے ساتھ یہی کرتے تھے۔

اسی ٹرپ میں زلفی اور جہانگیر نے بال ڈانس بھی سیکھنا شروع کیا۔ مجھے تب تک بال ڈانس کا ایکسپرٹ سمجھا جانے لگا تھا۔ میں نہ صرف اپنے دوستوں کو بلا کسی معاوضہ کے مشورے دینے لگا تھا بلکہ دونوں دوستوں کے ساتھ جو پیشہ ور ڈانسر ناچنے آتی تھیں انہیں بھی مشورہ دیتا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اپنی مرضی سے اس طرح کی چھٹی لی اور گذاری تھی۔ اس طرح 19 سال تک دوسروں کی زیر نگرانی رہنے کے بعد آزادی سے چھٹی گذارنے کے اس موقعہ کا میں نے پورا پورا استعمال کیا۔

انہیں سالوں میں کرپس مشن کے بعد کیبنٹ مشن آیا۔ مسٹر کرپس دل کے بہت اچھے تھے لیکن انہوں نے جو تجاویز پیش کیں وہ ہندو ستانیوں کی امیدوں کو پورا نہیں کر پا رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے جو تجاویز پیش کیں وہ ہندوستانیوں کی امیدوں کو پورا نہیں کر پا رہی تھیں۔ اگر وہ اس سے پہلے ہندوستان آئے ہوتے تو شاید کانگریس ان کی تجاویز کو یہ سمجھ کر منظور کر لیتی کہ ان کے ذریعے ہندوستان کو حکومت میں اور زیادہ حصہ مل جائے گا۔ لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ دوسرے ان تجاویز میں اس بات کی کوئی گارنٹی نہ تھی کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان خود بخود آزادی ہو جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں کرپس مشن کو بتائے گئے کانگریس کے مقاصد کے متعلق مختصر طور پر اس طرح تحریر فرمایا ہے:

1۔ میں اب صاف صاف دیکھ رہا تھا کہ برطانوی کیبنٹ جنگ کے دوران ہندوستان کو حکومت سونپنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ سرکارِ برطانیہ کا خیال ہے کہ ایسا کرنا جوکھم اٹھانا ہوگا اور اس طرح کا جوکھم اٹھانا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

2۔ جنگ کے حالات اور خاص طور پر امریکی دباؤ سے برطانیہ کے رویے میں معمولی سا فرق آیا تھا۔ چرچل سرکار بھی یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ہندوستان کو اپنی مرضی سے جنگ میں تعاون دینے کا موقعہ دیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی ایگزیکیٹو کونسل بنانے کے لیے راضی ہو گیا تھا جس میں صرف ہندوستانی ہی ہوں۔ وہ کونسل کو اور زیادہ حقوق دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ قانون کی نظر سے یہ کونسل کیبنٹ نہیں مانی جا سکتی تھی۔ اس کی حیثیت محض کونسل کی ہی رہتی۔

3۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں رہے گا۔ جو بات چیت ہوئی اس کا نچوڑ یہ نکلا کہ کسی بھی معاملے پر آخری فیصلہ وائسرائے کا ہی ہوگا۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

4۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں رہے گا۔ جو بات چیت ہوئی اس کا نچوڑ یہ نکلا کہ کسی بھی معاملے پر آخری وائسرائے کا ہی ہوگا۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

5۔ جہاں تک مستقبل کا سوال ہے یہ ممکن ہے کہ برطانیہ کی سرکار سر اسٹیفرڈ کرپس کے الفاظ میں ہندوستان کے مسئلے پر نئے نقطۂ نظر سے غور کرے گی۔ لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائیگی۔

6۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ جنگ کے بعد چرچل سرکار کی جگہ کوئی دوسری نئی سرکار لے گی۔ ممکن ہے کہ وہ سرکار ہندوستان کے سوال پر زیادہ ہمدردی اور سمجھداری سے غور کرے۔ لیکن ظاہر تھا کہ اس طرح کے کسی بھی امکان کو قرارداد کا جز نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

7۔ اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کانگریس کرپس قراردادوں کو تسلیم کر لیتی ہے تو جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کی آزادی کے متعلق کھلے الفاظ میں کوئی وعدہ نہیں کیا ہو جا سکے گا۔

ہندوستان کو آزادی ملنے کی جو امید تھی اور جو دلاسے دیے جا رہے تھے ان کے درمیان بہت وسیع کھائی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب نہیں کہ کرپس مشن ناکام رہا۔ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ برطانیہ کے لیے جنگ میں فتح اب بھی خواب تھی اور چرچل اب بھی برطانیہ سرکار کے سب سے بڑے عہدے یعنی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھے۔ اگر سر کرپس کے بس کی بات ہوتی تو وہ اسی وقت کانگریس کے سامنے ایسی قرارداد رکھتے جو کانگریس کو منظور ہوتیں اور وہ کانگریس کی منظوری لے کر فوراً واپس چلے جاتے۔ کرپس مشن کی ناکامی سے توازن اس

قدر زیادہ بگڑ گیا اور اس کے نتائج اس قدر خراب نکلے کہ یہ برطانیہ نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچے ہونگے۔ کچھ عرصہ تک بے چینی بھری خاموشی طاری رہی اور پھر اس کے بعد تاریخ احتجاج ''بھارت چھوڑو'' چھڑ گیا۔ برطانیہ سرکار اور کانگریس آمنے سامنے ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ جب تک جنگ کا پانسہ برطانیہ کے حق میں نہیں پلٹا اور لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے نہیں ہوئے تب تک شملہ کانفرنس کی شکل میں ہندوستان کے ساتھ سمجھوتے کی کوئی نئی کوشش برطانیہ نے نہیں کی۔ شملہ کانفرنس کی بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کے بعد اچانک یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستان کی آزادی صرف اسی بات پر منحصر نہیں ہے کہ برطانیہ سیدھے سیدھے حکومت ہندوستان کے حوالے کر دے۔ بلکہ اس سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں حکومت کس کے حوالے کی جائے۔ کانگریس کے لیڈر یہ محسوس کر رہے تھے کہ غیر ملک کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنا جس قدر آسان ہے اسی قدر دشوار ہے اپنے مسلم بھائیوں سے بات کرنا۔

بھارت چھوڑو تحریک کے دنوں سے لے کر شملہ کانفرنس تک مسٹر جناح نہایت خاموشی سے لیکن بڑی محنت سے پاکستان بنائے جانے کی مناسبت کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس دلائل یکجا کر رہے تھے وہ ہندوستان کے اندر ہی مسلمانوں کا ایک علیحدہ ملک چاہتے تھے۔

پاکستان مسٹر محمد علی جناح کی سوجھ اور حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کا ہی انجام نہین تھا بلکہ اس میں بہت کچھ قصور کانگریس کے پھوہڑ پن یا اجڈ رویئے کا بھی ہے جو اس نے مختلف مذہبی فرقوں کو گارنٹی دینے کے بارے میں اپنایا تھا۔ ایسے ہی ماحول میں برطانیہ سرکار نے کیبنٹ مشن کو کافی حقوق دے کر ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا۔ اس دوران چرچل الیکشن ہار گئے تھے اور ان کی گہ مسٹر کلیمنٹ ایٹلی نے لے لی تھی۔ ہندوستان کے لیے ان کے خیالات میں جو نرمی اور ہمدردی تھی وہ سبھی جانتے تھے۔

کیبنٹ مشن کا پلان قریب قریب کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی منظور کر لیا تھا۔ اس منظوری پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی تائید کی مہر لگنی باقی تھی۔ برسوں سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان مسودوں کو جوں کا توں تسلیم کرتی چلی آئی تھی جو ورکنگ کمیٹی تیار کرتی تھی لیکن کیبنٹ مشن کے پلان کی منظوری کی قرارداد کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں بڑی مشکل کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کانگریس کے سماج وادیوں اور بائیں بازو کے لیڈروں نے بڑی گرما گرم تقریریں کر کے بار بار اس قرارداد کو ٹھکرا دینے پر زور دیا۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سر کامیابی کا سہرا بندھا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کثرت رائے سے کیبنٹ مشن پلان کو منظوری دے دی۔

مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے بھی یہ پلان منظور کر لیا تھا کیونکہ پاکستان کو عملی شکل تو نہیں دی گئی تھی لیکن اس کی بنیادی باتیں تسلیم کر لی گئی تھیں۔ ہر طرح سے یہ بہتر سمجھوتا تھا۔ اس سے ہندوستان کے ٹکڑے ہونے سے بچ جاتے۔ بنا خون خرابے کے ہندوستان آزاد ہو جاتا۔ ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہ کی جاتی اور ایک ہی ملک میں ایک دوسرے کے دشمن دو پڑوسی ملک نہ ہوتے۔

لیکن قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ ایسے عجیب و غریب لمحات آئے جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ ہی تبدیل کر دیا۔ 10 جولائی 1946ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کیبنٹ مشن کے پلان کو نا منظور کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس آئین ساز کمیٹی میں کسی بھی سمجھوتے سے بندھ کر نہیں جائے گی۔ وہ ہر معاہدہ سے آزاد ہو گی اور ہر حالت کا مقابلہ وقت کے تقاضے کے مطابق آزادی سے کرے گی۔

معاہدے میں شامل سبھی پارٹیاں نہرو جی کے اس جواب سے ایک دم بوکھلا اٹھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن کے پلان کو ٹھکرا دیا تھا۔ مسٹر جناح بھی بری طرح بپھر گئے انہوں نے کہا کہ صدر کانگریس کے اس خلاصہ سے اقلیت آئین ساز کمیٹی میں اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ دراصل کانگریس نے کیبنٹ مشن کے پلان سے منہ موڑ لیا ہے۔ اس لئے انہوں نے 27 جولائی کو بمبئی میں مسلم لیگ

کونسل کا اجلاس بلایا اور پاکستان بنائے جانے کا اپنا مطالبہ دہرایا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے براہ راست کاروائی کی جائیگی۔

اب کیا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا مڑ کر دیکھنے کا کوئی سوال ہی نہ رہ گیا تھا۔ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ہندوستان کو ہند اور پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانا تھا۔ جنہیں ایک دوسرے کے دشمن کی شکل میں مسلسل جھگڑتے رہنا تھا۔

اس وقت تک زلفی مسٹر جناح کا اور میں مہاتما گاندھی کا مرید گن گیا تھا۔ ذہنی طور پر میں ہندوستان کی تقسیم نہیں کر سکا اور نہ یہ سمجھ پایا کہ اس تقسیم مین عقل کا دخل کہاں تک ہے۔ دوسری طرف زلفی ہندوستان کی تقسیم کا پیروکار تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ بغیر پاکستان کے مسلمانوں کے حقوق اور بہتری کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔

ان دنوں اور سچ پوچھا جائے تو آج بھی لوگوں کے مختلف فرقوں یا جماعتوں میں تقسیم ہونے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ صوبائی یا مذہبی بنیاد پر تقسیم تو اور بھی سمجھ میں نہین آتی۔ میرا جو بھی مطالعہ تھا اور گھر کا جو نرمی بھرا ماحول تھا اس وجہ سے ہی میرے ایسے خیالات تھے میں نے ایک پبلک سکول میں پانچ سال گذارے تھے وہاں اونچ نیچ کا فرق بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں میں نے اسکول میں کسی قسم کا اختلاف نہیں دیکھا ڈہرہ دون سکول سیکولر سماج کی مثال تھا۔ زلفی کے گھرانے کا پس منظر اور اس کے گھر آنے جانے والوں کا اثر زلفی کے خیالات پر پڑا۔ وہ بمبئی میں رہتا تھا جہاں آئے دن فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہتے تھے۔ تناؤ پیدا ہوتا رہتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ جو افواہیں پھیلتی تھیں۔ ان سب نے زلفی کے خیالات اور اعتقاد کی تعمیر میں مدد دی ہوگی۔ ان سب کا اس کے دل پر ایک پختہ اور غیر قانونی اثر پڑا ہوگا۔ ممکن ہے کہ واقعات کا ایک پہلو ہی اس کے سامنے رکھا گیا ہو۔ ہمارے بحث ومباحثے اور دلائل کبھی ختم نہ ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوتے تھے ہم لوگ جو نظریہ اپناتے تھے وہ بنیادی کم ہوتا تھا۔ نہ ہی اس میں گہری سوجھ بوجھ ہوتی تھی۔ جو دلائل ہم پیش کرتے تھے آج جب ان پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان مین کس قدر ب

گئی۔ میری سمجھ سے اس کا سہرا زلفی کے سر ہے۔ وہ ذاتی طور پر اس قدر فادار تھا کہ اس کی دوستی میں فرق آنا ممکن نہ تھا۔ اپنے تمام دوستوں کی گالیاں اور غصہ پی جانے کی طاقت اس میں تھی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہونے والے جھگڑوں کو بھلا دینے کی بے پناہ قوت تھی۔ دوستوں کے لیے احترام کا گہرا جذبہ تھا۔ زلفی کی شخصیت کا یہی سب سے زیادہ پرکشش پہلو ہے۔ اس کی ایک سب سے بری بات یہ ہے کہ جو لوگ اس کے دوست نہ ہوں یا جن کی وہ کوئی پروانہ کرتا ہو ان کے لیے اس کے دل میں ذرہ برابر بھی احترام اور عزت نہیں ہوتی تھی۔ وہ جس بداخلاقی کے ساتھ ان سے پیش آتا تھا اس سے ہم سبھی دوستوں کو افسوس ہوتا تھا۔ لیکن ان تمام کمیوں اور کمزوریوں کے باوجود زلفی میں کچھ ایسی انسانی خصوصیات تھیں جو اسے پختگی اور پائیداری بخشتی تھیں اور جن کی وجہ سے اس سے کبھی ختم نہ ہونے والی دوستی قائم ہو جاتی تھی۔

چوتھا باب

روزگار کی تلاش

1946ء کے آخر میں جنگ سے تباہ و برباد دنیا پھر اپنے پرانے معمول پر آتی جا رہی تھی۔ میں نے فن تعمیر کی تعمیل کے لیے ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ میں ڈیڑھ سال سے جے۔ جے۔ اسکول آف آرٹس میں فن تعمیر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اپنی کلاس میں پڑھنے کے علاوہ میں نے فن تعمیر کے مطالعہ میں ایک درجن گھنٹے بھی کبھی صرف کئے ہوں۔ اسی دوران ''لائف'' رسالہ میں کیلیفورنیا کے فن تعمیر کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کا مجھ پر گہرا اثر پڑا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں کیلیفورنیا جاؤں گا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکا تو امریکہ تو ضرور ہی جاؤں گا جس سے اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ جب مجھے دوسرے ملکوں کا سفر کرنا چاہئے تھا اور غیر ملک میں تعلیم حاصل کرنے کی اپنی خاندانی روایت کو نبھانا چاہئے تھا۔ سچ تو ہے کہ میرے دوسرے بھائی اور میرے خالہ زاد بھائی اپنے اپنے والد کی طرح پہلے ''ہیرو'' جاتے رہے تھے اور اس کے بعد آکسفورڈ جا کر اپنی تعلیم مکمل کرتے رہے تھے۔ ہندوستان میں میری تعلیم کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ میں انگلینڈ میں کامن انٹرنس کا امتحان پاس کر سکوں۔ قاعدے سے مجھے ستمبر 1939ء میں انگلینڈ جانا تھا یا زیادہ سے زیادہ اس کے اگلے سال۔

ہٹلر نے دنیا کو بھلے ہی تباہ کیا ہو لیکن ذاتی طور سے جہاں تک میرا سوال ہے اس نے میری بہت مدد کی۔ اگر جنگ نہ ہو رہی ہوتی تو مجھے بھی اپنے خاندان کی روائت کے مطابق ہیرو اور آکسفورڈ جانا پڑتا اور تب شاید میں آزاد ہندوستان میں ہی واپس لوٹتا۔ اس وقت نہ میں تیتر ہوتا اور نہ بٹیر۔ نہ گھر کا ہوتا اور نہ گھاٹ کا۔ جنگ نے میری زندگی کے رخ ہی کو تبدیل کر دیا اور مجھے ہیرو کے بجائے ڈہرہ دون اسکول جانا پڑا۔ اس کی وجہ سے میں نے ہندوستانی تہذیب کو اپنے آپ میں سمو لیا اور میرے تعلقات ہندوستانی سماج کے اونچے طبقے سے قائم ہوئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ میرے دوست بنے اور سارے ملک میں میرے تعلقات قائم ہو سکے۔

اگر انگلینڈ جانا ملتوی نہ ہوا ہوتا۔ تو شاید زلفی سے بھی میری ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ ہماری ملازات آکسفورڈ میں ہوتی۔ جہاں کے حالات کافی مختلف ہوتے اور پس منظر اور ماحول بھی قطعی جداگانہ ہوتا۔

دوستوں اور حاکموں سے کافی خط و کتابت کرنے کے بعد مجھے آخر میں ہارورڈ، دی یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے میں داخلہ مل گیا۔ اب یہ میری مرضی پر تھا کہ میں ان تینوں میں سے کسی یونیورسٹی کو انتخاب کروں۔ میرے پاس ان یونیورسٹیوں

کے متعلق کوئی ایسی جانکاری نہ تھی جس کی بناء پر مین سوچ سمجھ کر فیصلہ کر پاتا۔ میں نے بغیر کسی جھجک کے ہارورڈ جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا ''چھیلوں'' کی یونیورسٹی تھی۔ آخر میں میں نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کو منتخب کیا۔ یہ اعلیٰ پائے کی یونیورسٹی تھی۔ اس کی ساکھ بھی اچھی تھی۔ میں ہوائی جہاز سے ہندوستان سے امریکہ پہنچا اور دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں جا اترا۔ میں نے جو انتخاب کیا تھا وہ بہت ہی مناسب اور صحیح ثابت ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ انتخاب بے بنیاد خیالوں کی وجہ سے ہوا تھا۔

کافی عرصہ سے برکلے نرمی کی پالیسی اور کام دونوں کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔ یہ ایسی یونیورسٹی ہے جہاں بے چینی کے بیج بڑی آسانی سے بوئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہاں نئے خیالات اور نئے تخیل کا جنم ہوتا ہے۔ یہی نہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کیلیفورنی ریاست کی یونیورسٹی ہے۔ اس لئے امریکن سماج کا مالدار بطقہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ مالدار بطقہ کے طالب علموں کو اپنی یونیورسٹیوں میں ہی تعلیم حاصل کرنا پسند ہے۔ کیونکہ یہاں ان کے سامنے سخت روایتی نظریہ رکھا جاتا ہے۔ یہ یونیورسٹی بہت بری ہے۔ تقریباً چوبیس ہزار طالب علم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ساتھ اور کیمپس بھی ہیں جن میں مخصوص موضوعات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

برکلے یونیورسٹی چھوٹی نہیں تھی اس لیے وہاں کے طالب علم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح اور قریب سے نہیں جان پاتے تھے۔ اس کمی کو اونچے درجہ کی تعلیم سے پورا کیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے پاس اتنے زیادہ ذرائع تھے کہ ان عالموں کو بلانے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی تحقیق کی بھی سہولتیں ہیں۔ یونیورسٹی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کسی بھی عظیم شخصیت سے بیس گز دور بیٹھنا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن کسی معمولی شخص کے پانچ فٹ قریب بیٹھنا مناسب نہیں۔ برکلے یونیورسٹی برکلے پہاڑی کے دامن میں سان فرانسسکو خلیج کے علاقے میں تھی۔ یہاں کے قدرتی مناظر اسے اور بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے سان فرانسسکو خلیج کا یہ علاقہ ایسا ہے جہاں کی آب وہوا دنیا میں سب سے بہتر مانی جاتی ہے۔ موسم گرما میں یہاں زیادہ گرمی نہیں پڑتی اور موسم سرما میں بہت زیادہ سردی نہیں پڑتی۔ سمندر کا کنارا بالکل قریب ہے۔ پہاڑ بھی بغل میں ہی ہیں۔ جھیلیں ہیں جنگل ہیں اور نیشنل پارک ہیں۔ خلیج کے دوسرے کنارے پر سان فرانسسکو شہر آباد ہے۔ اسے آسانی سے دنیا کا سب سے بڑا شہر کہا جا سکتا ہے۔ شہر کا ماحول ہر ملک کے باشندے کے لیے یکساں ہے۔ شہر کی بدحالی اور بدحالی اور بدانتظامی کے دلچسپ نظارے بھی یہاں نظر آتے ہیں۔

میں ٹرانس ورلڈ ائیرویز کی ہوائی سروس کی پہلی اڑان سے بمبئی سے نیویارک پہنچا تھا۔ جو اسی دن شروع ہوئی تھی۔ میں 10 جنوری 1947ء کو روانہ ہوا اور 13 جنوری کو نیویارک پہنچا۔ میں نے ڈی۔سی۔4 اسکائی ماسٹر قسم کے ہوائی جہاز سے سفر کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ہوائی جہاز کچھ لوگوں نے چارٹر کر لیا ہے۔ اس میں کل چھ مسافر تھے سبھی سے پرانی واقفیت تھی اور سبھی بمبئی کے رہنے والے میرے قریبی دوست تھے۔ ان میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن کرشنا ہٹھی سنگھ اور ان کے خاوند راجہ، بمبئی کے کئی کارخانواں کے مالک فالی مہتہ، اخبار نویس اور مشہور کرکٹ کمنٹیٹر بابی تلیار خان کی بہن بینبر تلیار خاں اور روسی تلیار خان جو بعد مُن بولٹاز کے چیئر مین بنے، اور ایک کوئی پٹیل بھی تھے اس سفر میں ہمارے ساتھ اس ہوائی کمپنی کے ڈپٹی سدر جنرل جیلس بھی تھے۔ ہر ہوائی اڈے پر ہمارے ہوائی جہاز کو مشینی مرمت کے لیے کئی کئی گھنٹے رکنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ رکنا بھی بہت دلشسپ اور مزیدار تھا۔ کیونکہ ہم جب چاہتے پائلٹ سے اصرار کرتے کہ وہ جہاز کو گھما لے تا کہ ہم نیچے کے مناظر کو قریب سے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ ہم لوگوں نے اس طرح مصر کے اہرام دیکھے اور اسی طرح یونان میں ایکروپولس کے کھنڈرات دیکھے۔

یہ وہی پرانا جانا پہچانا راستہ تھا جس پر آٹھ مہینے کے بعد زلفی اور جہانگیر موگا سیٹھ کو سفر کرنا تھا۔ جہانگیر اور دھرمسی مشرقی کنارے پر پریپ اسکول میں گئے اور زلفی نے اینجلس کی یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں داخل لیا۔

اگلے ڈیڑھ سال تک زلفی اینجلس میں رہا اور میں برکلے میں۔ ہفتہ وار چھٹیوں اور دیگر چھٹیوں میں ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہرے۔

ان دنوں میں بینکرافٹ روڈ پر رہتا تھا۔ میرے ساتھ عزیز پہانی بھی رہتے تھے۔ سکی زمانے میں ارونا آصف علی کے ساتھ انہوں نے ایک تحریک میں حصہ لیا تھا اور ان کا شمار بائیں بازو کے گرفتم کے سیاست دانوں میں کیا جاتا تھا۔ عزیز کے ساتھ رہنے پر مجھے اپنی نرم خیالوں کی فلاسفی کو ایک شکل دینے میں مدد ملی۔ میں نے اپنے شدت پسندانہ خیالات کے ساتھ ساتھ عزیز کے گرم انقلابی خیالات کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ طبقوں کی باہمی جدوجہد کے اصول میں اعتقاد رکھنے کی وجہ سے عزیز کے مزاج اور برتاؤ میں جو تلخی آ گئی تھی اسے بھی میں نے نہیں اپنایا۔ اگلے ٹرم میں عزیز ایک کوآپریٹو میں چلا گیا اور میں ایک کمرہ میں جمی فوجدار کے ساتھ رہنے لگا۔ جمی کٹر بہائی تھا۔ اس مذہب کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ سائنسی قصوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ان قصوں کے خواب جو خلائی سفر کی یادگاریں تھیں۔ جمی اور میرے درمیان کسی بھی بات پر اتفاق نہ تھا۔ دراصل آج بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری دنیا کا باشندہ تھا۔ لیکن ہم لوگوں کے خیالات میں اس قدر نا اتفاقی ہوتے ہوئے بھی جمی میرا بہت ہی پیارا اور وفادار دوست ہے۔ حالاں کہ ہم دونوں میں کبھی کبھی ہاتھا پائی کی نوبت تک آ جاتی تھی۔ اس کیباوجود ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ عمر میں میں جمی سے بڑا تھا۔ جمی کی دوست پارو نہایت شیریں مزاج لڑکی تھی۔ ہم دونوں میں جھگڑا ہونے پر وہ صلح کرا دیتی تھی۔ بعد میں جمی نے پارو کے ساتھ شادی کر لی۔ گذشتہ برسوں میں کئی مرتبہ ہماری ملاقاتیں ہوئیں لیکن ہماری بحث کی تیزی اور تلخی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاں عمر زیادہ ہو جانیکی وجہ سے ہم آپس میں ہاتھا پائی کر کے اپنے اختلافات دور کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہین۔

جم ستمبر 1947ء میں چلا گیا اور اس کے جگہ مادھو پرساد آ گیا مادھو پرساد سے میری دوستی ڈہرہ دون اسکول کے زمانے سے تھی۔ ہم لوگ اسے مادھو یا نیٹی کہتے تھے۔ ہم دونون ڈہرہ دون اسکول کے طالب علم تھے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی کئی باتوں میں یکسانیت تھی۔ ہم دونوں کی جسامت اور عادات بھی بہت کچھ ملتی تھیں۔ پسندیدگی اور ناپسندیدگی بھی ایک جیسی ہی تھی۔ ہم لوگوں میں اگر کبھی کسی بات پر بحث ہوتی تھی تو صرف ایک ہی بات پر۔ وہ یہ کہ کھانا کہاں کھایا جائے اور کیا کھایا جائے۔ چند دنوں میں ہی میں نے اسے گوشت خور بنا کر کھانے کے بین الاقوامی درجہ تک پہنچا دیا۔ شروع میں نیٹی خالص سبزی خور تھا۔

تب ہی زلفی کیلیفورنیا پہنچا۔ ہم لوگ امریکن فٹ بال سے بہت متاثر ہوئے۔ حالانکہ ہم میں سے زیادہ تر کے لیے یہ ایسا کھیل تھا جسے ہم صرف دیکھ ہی سکتے تھے۔ امریکن فٹ بال لیگ میچوں میں ہوتا تھا اور فائینل میچ سادونا میں یا روز باؤل میں ہوتا تھا۔ فائنل میں پیفک لیگ اور بگ بٹن کے جیتے ہوئے کھلاڑیوں کی بھڑنت ہوتی تھی۔ بگ بٹن وسطی مغربی یونیورسٹیوں کی لیگ تھی۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کی ٹیم عام طور پر روز باؤل کے فائنل میں ٹورنامنٹ جیت کر انعام حاصل کرنے والی دو ٹیموں میں سے ایک ہوا کرتی تھی۔ امریکہ میں پاساڈینا میں روز باؤل کی پریڈ قابل دید ہوتی ہے اور یہ سال کا سب سے دلچسپ اور خوبصورت تہوار مانا جاتا ہے۔ یہ پریڈ ہر نئے سال کے پہلے دن ہوا کرتی ہے۔ اس پریڈ کو دیکھنے کے بعد ہم لوگ میچ دیکھنے جایا کرتے تھے۔

پاساڈینا اور پریڈ، روز باؤل اور فٹ بال یہ سب بہت ہی دلچسپ مقام اور واقعات تھے۔ لیکن ہم لوگوں کا ہمیشہ خاص مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے ملیں۔ اس طرح اسٹان فورڈ اور یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا کے ہم سب دوست مل جاتے تھے اور ہفتہ کے آخری دن

ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔

میرے کیلیفورنیا پہنچنے سے پہلے ہی لاس انجلس میں ڈہرہ دون اسکول کا میرا ایک اور دوست رہتا تھا۔ وہ تھا سردار مدن جیت سنگھ ملک ،وہ بھی یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں کئی سالوں سے فن تعمیر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہ خود ایک ادارہ بن گیا تھا۔

وہ ہندوستان کو آزادی مل جانے کے بعد کے دن تھے۔ امریکن اخباروں میں ہندوستان کے متعلق بہت تھوڑی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ہم لوگوں کی بحث اکثر حیدر آباد، جوناگڑھ اور کشمیر کے مسئلوں پر ہوتی تھی یا پھر ہم لوگ ریاستوں سے جلاوطنی کے سوال پر بحث کیا کرتے تھے۔ جو بربریت، حیوانیت اور خونریزی ہوتی تھی اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اکثر ہم لوگ انٹرنیشنل ہاؤس جیسے کسی مرکزی مقام پر چلے جاتے تھے اور وہاں واشنگٹن کے ہندوستانی سفارت خانہ سے شائع ہونے والے خبروں کے بلیٹن پڑھا کرتے تھے۔

ہم لوگ روز باؤل سے لوٹ کر لاس انجلس پہنچے ہی تھے اور جنوری کا مہینہ ختم نہ ہوا تھا کہ زلفی ہم لوگوں کے ساتھ کچھ دن گذارنے کے لیے بر کلے آ گیا۔ وہ 1948ء کی 30 جنوری تھی۔ میں کوئی امتحان دینے صبح گیا تھا۔ ابھی واپس آیا ہی تھا کہ میرے گھر میں رہنے والے لڑکوں میں سے ایک نے کہا۔ ''تم نے یہ خبر سنی! مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا'' مجھے یقین نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیوں میرے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ گاندھی جی کی موت بھی ہو سکتی ہے۔ میں برسوں سے گاندھی جی کا مرید ہوں۔ اس حد تک تو نہیں کہ ان کے اصولوں پر مسلسل عمل کرتا رہوں لیکن ان کے لیے میرے دل میں بے حد عقیدت اور عزت رہی ہے۔ میرے لیے وہ ایسے سنت، فلسفی اور رہنما تھے جو کبھی کوئی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ گاندھی جی کے بغیر ہندوستان کا تخیل دشوار تھا۔ گاندھی جی ہندوستان کو امن و آشتی کی راہ پر لے جا کر آزادی کے لیے جدوجہد کر سکتے تھے۔ گاندھی جی ہی یہ کہہ سکتے تھے کہ موزوں مقصد حاصل کرنے کے لیے غیر موقوں ذرائع اپنانا ٹھیک نہیں ہے۔ میں گاندھی جی کی زندگی کو اس جدوجہد کی علامت مانتا تھا جو وہ کر رہے تھے۔ میں اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا کہ میں ان کی نصیحتوں پر عمل کروں۔ لیکن ان کی امن و آشتی سے بھرپور جدوجہد ایسی زندہ مثال تھی کہ وہ آج بھی میری روح کی اصلی کسوٹی ہے۔

برسوں بعد میں نے چند الفاظ لکھے۔ جن سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ گاندھی جی کے لیے میرے دلی جذبات اور احساسات کیا تھے۔

بہت سے لوگ انہیں سمجھے نہیں۔ انگریز ان سے چڑتے تھے۔

نہرو ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن ان سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔

راجا ان کی غلطیاں سدھا دیتے تھے۔ سردار پٹیل ان کا ہر حکم بجالاتے تھے۔ آچاریہ ان کے پجاری تھے۔ بہت سے لوگ ان کی تعریف کرتے تھے چند لوگ ان کی برائی کرتے تھے۔

لیکن وہ ان سب سے محبت کرتے تھے۔

محبت ہی ان کی طاقت تھی۔ محبت کی ہی وجہ سے وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ محبت میں تشدد اور خونریزی کا کوئی مقام نہ تھا۔

وہ سچائی کی بنیاد محبت کو مانتے تھے۔

وہ محبت سے تعمیر کرتے تھے۔ محبت سے چیزیں بناتے تھے اور محبت سے رہتے تھے۔

ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو بھلا دیا گیا۔ لیکن ان کے شاگرد ساری دنیا میں ہیں۔ نوجوان، غریب اور نئی دنیا کے خواب دیکھنے والے انہیں یاد کرتے ہیں۔

کیوں، کیوں۔ان کے شاگردوں نے ہی ان کے پیغام کو بھلا دیا۔

وہ بے خوف تھے۔خوف کو انہوں نے نہیں جانا۔انہیں صرف بھگوان کا خوف تھا۔کیا انہوں نے بھگوان کو صحیح صحیح سمجھ لیا تھا۔

وہ ہمیشہ ان کروڑوں لوگوں کی بہتری کے بارے میں سوچتے تھے جو اپنا دکھ کہنے سے قاصر تھے۔انہیں دولت یا دولتمندوں کی پروانہ تھی۔وہ سب سے ملنا چاہتے تھے اور لوگ بھی ان کے دیدار کے لیے بے قرار رہتے تھے۔

لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟

یہ صرف تبھی ممکن تھا جب وہ ان تمام خیالوں کو خیر باد کہہ دیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ضرورتوں کی ہوس کو چھوڑ دیں۔صرف زندگی کے لیے جو ضروری ہے اتنے میں ہی زندگی بسر کریں اور صاف و پاک زندگی گذاریں۔

انہوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی۔لیکن اس سے بھی زیادہ جدوجہد کی ان برائیوں کے خلاف جو کسی بھی ہندوستانی کے دل میں رہتی ہیں اور اس سے بھی زیادہ جدوجہد کی اپنی ذات کے اندر بسی ہوئی بری باتوں کے خلاف۔

انہوں نے اپنی روح کو ہندوستان کی روح میں ملا کر اسے ہندوستان کی ہر دراڑ میں انڈیل دیا تھا۔

اور دوسری طرف انگریز تھے۔

ہاں، ان لوگوں کے پاس بہت بڑی سلطنت تھی، لیکن گاندھی جی کے پاس کوئی فوج نہ تھی۔وہ کوئی حکم نہ دیتے تھے۔ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔عبادت کے بعد ان کے دماغ سے خیالوں کا چشمہ پھوٹ پڑتا تھا۔بس یہی ان کی تنہا دولت تھی۔

''گاندھی ہندوستان تھے اور ہندوستان گاندھی۔''

اس وقت مجھے جو صدمہ پہنچا میں اسے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرے سر پر سے باپ کا سایہ ہٹ گیا ہے اور میں بے وطن اور بے قوم ہو گیا ہوں۔

میں دوڑتا ہوا گھر میں گھس گیا۔سیٹھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچا۔صدمہ کی وجہ سے سب پر جیسے سکتہ طاری تھا۔میں خود کو اور زیادہ روک نہیں پایا۔آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار پھوٹ پڑی۔ہچکیوں سے گلا رندھ گیا اگلے کچھ دن رنج و غم میں گذرے۔ان دنوں زلفی مجھے تسلی دیتا رہا اور غم دور کرنے میں اس نے میری بہت مدد کی اور رنج و غم کی اس حالت سے مجھے نکالا۔اس نے برابر اس بات کا خیال رکھا کہ وہ اپنے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکالے جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔آٹھ مہینے بعد ستمبر 1948ء میں جب مسٹر جناح فوت ہوئے تو میں نے بھی اس کی اسی طرح مدد کی۔

پانچواں باب

برکلے میں ساتھ ساتھ

ہندوستان سے باہر کسی غیر ملک مین رہنے پر ہندوسانی ہونے کے فخر میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ہر ہندوستانی چیز کو حاصل کرنے کی چاہت بھی بڑھ جاتی ہے۔ہندوستان میں ہرتے ہوئے ہم جن بہت سی چیزوں کی نکتہ چینی کرتے ہیں باہر رہنے پر وہاں کے ماحول میں ہمارا نکتہ چینی کرنے کا رویہ بدل جاتا ہے۔مادر وطن کی یاد بے چین کرنے لگتی ہے۔گھر سے جب کوئی خبر مل جاتی ہے تو اس یاد سے ہونے والی تکلیف کم ہو پاتی ہے۔آزادی کے بعد ہندوستان میں جو غیر یقینی باتیں ہوئیں انہیں سن کر نہ تو انہیں تسلیم کرنے کو دل چاہتا تھا اور نہ کانوں پر اعتبار ہی ہوتا تھا۔

گاندھی جی کے امن وآشتی پسند ہندوستان میں اتنے ظلم، اتنا خون خرابہ اور اتنی بربریت ہوگی۔ یہ ہماری سمجھ سے پرے تھی۔ ہم بڑی بے چینی سے اس خبر کے منتظر تھے کہ ہمیں جلد ہی اس ہنگامہ کے خاتمے کی خبر موصول ہوگی۔

انہیں دنوں نہرو جی نے امریکہ کا دورہ کیا۔ ہم لوگ بڑے شوق اور فخر کے ساتھ ان کے امریکہ کے دورہ کی خبروں کے ہر لفظ کو پڑھتے اور انہیں بار بار دہراتے۔ مجھے کیلیفورنیا کی خوبصورت گرمیوں کا وہ دن یاد ہے جب پنڈت جواہر لال نہرو نے برکلے میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے گریک تھیٹر میں تقریر کی تھی۔ نہ صرف ہال میں بلکہ ہال کے باہر تک طلبہ کی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ وہ منظر ہمیشہ یاد رہے گا۔ برکلے کی خوبصورت پہاڑیوں پر طلبہ ان کی تقریر سننے کے لیے جا بیٹھے تھے۔ پنڈت نہرو نے اس دن جو تقریر کی تھی اسے سن کر فخر سے میرا سینہ پھول گیا تھا۔ انہوں نے بے حد پر جوش الفاظ مین اپنی تقریر کا اس طرح اختتام کیا تھا۔

''آج اس وقت جب میں اس یونیورسٹی کے اس نہایت خوشنما اور کوبصورت ہال میں کھڑا ہوں قدرت کی خوبصورتی اور سکون نے مجھے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور چاروں طرف انسانی صلاحیتیں اور خوبیاں مجھے گھیرے ہوئے ہیں، تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا کے تمام ہنگامے اور پریشانیاں دور بہت دور چلے گئے ہیں۔ اس وقت ماضی کے واقعات ایک کے بعد ایک مجھے یاد آرہے ہیں۔ ایشیا کی تاریخ، یورپ اور امریکہ کا ماضی میری یادداشت میں ابھر کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے اور میں دور حال کی تلوار کی دھار پر کھڑے ہو کر مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہاں سے ماضی میں انسان کی لمبی جدوجہد اور کوشش وکاوشوں کو دیکھ رہا ہوں کہ اس نے کس طرح ان حالات کے خلاف جنگ شروع کی جو اس کے مخالف تھے اور دیکھ رہا ہوں کہ اس نے کس طرح لاتعداد مشکلات کا مقابلہ کیا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ انسان نے قربانی دی۔ نہ جانے کتنی مرتبہ سولی پر چڑھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ انسان کی روح بار بار اٹھی اور اس نے ہر مشکل اور مصیبت پر ہر مخالف صورتحال پر فتح حاصل کی۔ ہمیں ایسے تاریخی مناظر پر نظر ڈالنی چاہیے، ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہمت اور دلیری حاصل کرنی چاہیے۔ ماضی اور حال کے بوجھ سے دب نہیں جانا چاہیے۔ ہم ان عہدوں کے وارث ہیں۔ ان صدیوں کے جو ہم سے پیشتر گذر چکی ہیں۔ ان گذشتہ پیڑھیوں نے ہمیں دنیا کے اس سب سے زیادہ ہنگامی دور میں اپنے فرائض کی ادائیگی کا موقعہ دیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی وراثت ہے۔ بہت بڑے حقوق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے کندھوں پر جو ذمہ داری آپڑی ہے۔ اسے بھی ہمیں بے خوف وخطر ہو کر بغیر کسی شک وشبہ کے تسلیم کرنا چاہیے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اپنی آزادی کے لیے جو جدوجہد کی اس میں بے شمار ناکامیوں کے باوجود جو کامیابیاں ملیں اور جو حاصل ہوا وہ بہت شاندار ہے۔ اصلی آزادی محض سیاسی آزادی نہیں ہوتی۔ وہ روحانی اور اقتصادی تھی ہوتی ہے۔ یہ تینوں آزادیاں ملنے کے بعد ہی انسان سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ آزادی کا تخیل ہمیں صرف کسی ملک یا گروہ تک ہی محدود نہیں رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر ملک آمادۂ جنگ ہوجاتے ہیں۔ بلکہ مکمل ذاتی آزادی اور امن کی حد تک لے جاتا ہے۔ ایشیا، یورپ اور امریکہ کے مسئلے اب علیحدہ علیحدہ نہیں سلجھائے جاسکتے۔ کسی بھی ملک کا مسئلہ آج پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدوجہد اور مشکلات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری ہے گا۔ لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ انسانی روح جواب تک زندہ ہے ایک مرتبہ پھر فتحیاب ہوگی۔

خوش قسمتی سے مین محترمہ اندروز ڈی پل سے واقف تھا۔ وہ سان فرانسسکو میں اپنی مہمان نوازی کے لیے مشہور تھیں۔ انہوں نے وزیر اعظم کے اعزاز میں رات کو ایک دعوت کا اہتمام کیا اور مہمانوں کی لسٹ میں میرا نام بھی براہ کرم شامل کیا۔ اس دعوت میں بہت کم لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کا اہتمام انہوں نے سان فرانسسکو میں اپنے مکان پیفک ہائیٹس میں کیا تھا۔ صرف تیس مہمان بلائے گئے تھے۔ ان لوگوں

میں کئی لوگ امریکہ کے مختلف حصوں سے اور چند نیویارک سے ہوائی جہاز سے آئے تھے۔اس روز شام کو میرا زیادہ تر وقت لٹی پونس سے باتیں کرنے میں گذرا۔وہ مشہور رو معروف مغنی ہیں۔مجھے اس گفتگو سے بہت اطمینان حاصل ہوا کیونکہ مغربی کلاسیکی موسیقی میں میری بہت دلچسپی ہے۔ان دنوں واشنگٹن میں محترمہ وجے لکشمی پنڈت سفیر ہند تھیں۔وہ بھی اس دعوت میں شامل ہوئی تھیں۔ان کے داماد اوتار ورشان فرانسسکو میں ہندوستان کے سفیر تجارت تھے۔انہوں نے بھی اس دعوت میں شرکت کی۔محترمہ وجے لکشمی پنڈت اور جناب اوتار ور سے میری دوستی اور واقفیت کافی پہلے سے تھی۔لیکن نہرو جی کی موجودگی میں میں بالکل گنگ ہو جاتا تھا۔یہ ایک ایسی بات تھی جس پر میرے دوست آج بھی یقین نہیں کر پاتے۔

جنوری 1949ء میں زلفی یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا سے برکلے آ گیا اور اس نے پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لے لیا۔وہ ہمارے ہی ہوسٹل میں رہنے لگا اور ہم ایک کمرے کے مکین بن گئے۔انہیں دنوں ہمارے مکان مالک باب جیڈس نے 1800 آلسٹن وے میں ایک نیا مکان خرید لیا اور ہم لوگوں نے طے کیا کہ ہم اسی مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔حالانکہ وہ مکان یونیورسٹی سے کچھ دور تھا۔

دو سڑکوں کے کونے پر ویسٹ برکلے کے پرسکون محلے میں 1800 آلسٹن وے بہت ہی خوبصورت عمارت تھی۔سڑکوں پر دونوں طرف چیری بلاسم کے درخت تھے اور یہ مقام یونیورسٹی میں جہاں ہماری کلاسیں ہوتی تھیں وہاں سے تقریباً آٹھ بلاکوں کے فاصلے پر تھا۔اس مکان میں جانے سے پیشتر ہماری وار کونسل کی میٹنگ ہوئی جس میں دو اصولوں پر گھر کا سارا کام تقسیم کیا گیا۔پہلا اصول تو یہ تھا کہ ہر شخص کا کام پہلے ہی طے کر دیا جائے اور دوسرا یہ تھا کہ اس کا فیصلہ اس بناء پر ہو کہ اس کام کو پورا کرنے میں کس قدر وقت لگتا ہے نہ کہ اس بنا پر کہ کام اونچا ہے یا نیچا ہے۔

ان لوگوں میں میں ہی ایک ایسا شخص تھا جسے کھانا پکانے کے بارے میں معمولی سی جانکاری تھی۔اس لیے تمام ''جنگلیوں'' کو کھانا بنا کر کھلانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔مادھو پرساد اور یدو کول کو ڈشیں دھونے اور رسوئی گھر کی صفائی کا کام سونپا گیا۔زلفی سے کہا گیا کہ وہ پورے مکان کی جھاڑ یو بہارو کرے اور لوگوں کے بستر وغیرہ ٹیک سے لگائے کمیون زندگی کے اس سے زیادہ قریب ہم کبھی نہیں پہنچے۔یہ انتظام تقریباً آخر تک بہت بہت اچھی طرح چلتا رہا۔لیکن آخر میں ختم ہو گیا۔کیونکہ یدو کے لیے ڈشیں دھونا زبردست دردسر ثابت ہوا۔جن چیزوں سے پلیٹیں دھونی پڑتی تھیں ان میں ہاتھ ڈالنے کی وجہ سے یدو کی چمڑی جلنے لگی اور اسے بہت تکلیف ہونے لگی۔آصف کریم بھائی اور ابڈمینن اوپر کی منزل میں چلے گئے۔

1800 آلسٹن میں ہمارے آ جانے کے بعد یہ مکان مختلف جماعتوں، سیاسی بحث مباحثوں اور ہفتہ کے آخر کی چھٹیوں کے کیمپ جیسی مختلف سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔کئی بار ایسا ہوا کہ ہم لوگ رات رات بھر یا دو تین بجے تک سیاست اور اکنامکس پر بحث کرنے میں سونا ہی بھول گئے۔جو لوگ بحث سننے کے شوقین تھے وہ اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے۔ہفتہ کے آخر میں بہت سے طلبہ ہمارے یہاں آ جاتے تھے۔

اسی دوران میری ملاقات دینا سے ہوئی۔جس کے ساتھ کئی سال بعد 1953ء میں میری شادی ہوئی۔کئی طور طریقوں سے دینا کی عادتیں زلفی کی عادتوں سے ملتی تھیں۔وہ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے فوراً تیار ہو جاتی تھی۔کہیں بھی جانا ہو اور کچھ بھی کرنا ہو۔دونوں کا دل بے حد نرم اور وسیع تھا۔اس کے دل میں میرے لیے بے حد وفاداری اور محبت تھی۔لیکن دینا اور زلفی میں ایک فرق بھیت ھا۔زلفی دکھاوے کا بہت شوق تھا لیکن دینا کو دکھاوا قطعی پسند نہ تھا۔وہ خدمت میں خود کو مٹا دینا چاہتی تھی۔

پوری زندگی میں زلفی اور میں پالیٹکل سائنس کے شعبہ میں گریجویشن کورس کے علاوہ اور کبھی ہم جماعت نہیں رہے۔یہاں ہمارے

پروفیسر لپسکی تھے۔ یہ کورس بہت ہی سخت اور پیچیدہ تھا۔ ہمیں تاریخی فلسفہ کی تعلیم سقراط اور پلاٹو سے لے کر موجودہ دور تک دی جاتی تھی۔ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ بین الاقوامی تعلقات کے اصول کا تاریخ پر کیا اثر پڑا ہے۔ زلفی اور میرے درمیان مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور یہ مقابلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا جس وقت تک ہم دونوں نے اس کورس میں ''اے'' گریڈ حاصل نہیں کر لیا۔ فن تعمیر اور پولیٹکل سائنس کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن زلفی کیلیے پولیٹکل سائنس ضروری تھی کیونکہ وہ بین الاقوامی قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

زلفی اور میں پروفیسر ہنس کیلسن کا بہت احترام کرتے تھے اور انہیں بین الاقوامی قانون کا ماہر مانتے تھے۔ پولیٹکل سائنس کے انڈر گریجویٹ کورس میں وہ میرے استاد رہ چکے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو پروفیسر ہنس کیلسن نے جمہوری خیالات اور سلوک کے حلقہ میں ہماری بنیادی بنیادیں مضبوط کیں۔

آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہین ہے جو زلفی پر شک کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے اس میں ایمانداری نہیں ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ تاریخ اور بین الاقوامی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی من مانی کرنے اور موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لوبھ لالچ پر زلفی نے فتح حاصل کی ہے یا نہیں۔

موجود تاریخ کے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں اپنے جمہوری اصولوں پر بڑی مضبوطی سے قائم رہا ہوں۔ لیکن زلفی کو ایسا کرنے میں ابھی کئی گھاٹ کا پانی پینا پڑے گا۔ لیکن اس کی وجہ بہت کچھ یہ ہو سکتی ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں کسی حد تک جمہوریت رہی ہے جبکہ پاکستان کی سیاسی حالت نہایت ہنگامی رہی ہے اور پاکستانی عوام کو مختلف سیاسی نظاموں میں رہنا پڑا ہے۔

زلفی اپنی تعلیم پر ہر سال زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت کرتا گیا۔ اس کا ذہن اور بھی وسیع ہوتا گیا اور وہ پاکستان کے سیاسی مستقبل کے لیے خود کو تیار کرتا رہا جس کے متعلق اس کے دل میں نہ کبھی شک پیدا ہوا اور نہ جھجک۔

تجربہ کے طور پر زلفی نے یونیورسٹی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ یونین کونسل کی بارہ سیٹوں میں سے ایک سیٹ کے لیے وہ کھڑا ہوا۔ یہ کونسل ایسوسی ایشن آف سٹوڈنٹس کی انتظامی کونسل ہے اور کیلیفورنیا یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے۔ ہم سب لوگوں نے زلفی کو کامیاب بنانے کی کوشش کی اور زلفی کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ حالانکہ زلفی کا اب بھی یہی کہنا ہے کہ میں نے اس الیکشن میں زلفی کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ زلفی پہلا ایشیائی طالب علم تھا جس نے کونسل کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ہم سب کو اس کی کامیابی پر بڑا فخر تھا۔

ان یادوں کو مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں اس تھوڑے سے وقت کا بھی ذکر کروں جب میں زلفی سے بہت ناراض تھا۔ اس قدر ناراض کہ میں نے اس سے بات کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ لیکن دوستی اور وفاداری کے متعلق زلفی کے خیالات جداگانہ ہیں اور ان میں پختگی اور پائیداری ہے۔ حالانکہ میں نے اس کے ساتھ بہت ہی بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔ پھر بھی وہ میرا بستر وغیرہ اسی طرح صاف کر کے لگاتا رہا گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہی زلفی کی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کا چہیتا بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں کسی کے لیے ایک مرتبہ جب بن جاتا ہے تو پھر اسے کوئی دوسرا چھین نہیں سکتا۔ ایسے دوست کے لیے اس کی محبت اور خدمات میں کوئی کمی نہیں ہو پاتی۔ دوستی میں بدلے کا کوئی سوال نہیں۔ دوستی سب کچھ نچھاور اور قربان کر دینے کا نام ہے۔

ہر ہنسی خوشی کی طرح برکلے کے پر کیف دنوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ آکسفورڈ میں اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لیے زلفی انگلینڈ چلا گیا۔ جہاں اس نے آکسفورڈ کے بعد ''لنکنز ان'' میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ میں فن تعمیر میں ایم۔اے کی ڈگری کے لیے برکلے میں رہ گیا۔ زلفی

کے برکلے سے چلے جانے کے بعد میں نے گرمی کی چھٹیاں وینا کے ساتھ یورپ میں گذاریں۔ دوسرے کاموں کے ساتھ فن تعمیر اور موسیقی کے میرے شوق بھی جاری رہے۔

بی۔اے کرنے کے بعد بنٹی بھی ہندوستان چلا گیا اور کول مشرقی ساحل کے کسی مقام پر چلا گیا۔ ان کی جگہ اعظم عارف نے لے لی۔ عارف بھی ڈہرہ دون اسکول کا طالبعلم رہ چکا ہے اور فن تعمیر کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے برکلے میں آیا تھا ایڈمینن ہم لوگوں کے ساتھ نیچے کی منزل میں آکر رہنے لگا۔ برج تھا پڑا اور اندر چھابڑہ اوپر کی منزل میں جا کر رہنے لگے۔ یہیں سے زلفی کے ساتھ میرا سلسلہ ٹوٹ گیا اور ہم دونوں دنیا میں اپنے اپنے علیحدہ علیحدہ راستوں پر اور جو کچھ ہمارے نصیب میں تھا اسے حاصل کرنے یا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔

چھٹا باب

راستے کے بھٹکاؤ

اس مقام پر یہ ضروری ہے کہ وقت نے زلفی کی شخصیت کی تعمیر کس طرح کی اس پر روشنی ڈالی جائے اور اسے پرکھا جائے۔ بدقسمتی سے گھر والوں نے زلفی کی تعلیم کی ابتداء اس وقت سے نہیں کی جب اس کی عمر نو برس کی تھی۔ اس لیے زلفی پڑھائی شروع کرنے میں کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ پیچھے رہ جانے کی وجہ سے اگلے نو سالوں تک زلفی کو بہت زیادہ محنت اور مشقت کرنی پڑی۔ وہ ہمیشہ درجے میں پیچھے رہتا اور اسے دوسرے طلبہ کے برابر آنے کے لیے جی توڑ کر کوشش کرنی پڑتی۔ زیادہ تر لوگ اس طرح پیچھے رہ جانے کے بعد کمی کو پورا نہیں کر پاتے۔ لیکن یہیں زلفی کی خوبیاں اور صلاحیتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس نے ایک پختہ عزم و استقلال کے ساتھ شروع کی دشواریوں پر فتح حاصل کی اور پھر نہایت شاندار طریقے سے ہر امتحان میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔ یہ سب اس کے بہتر ذہن، دلکش شخصیت اور نہایت روشن دماغ ہونے کا نتیجہ تھا۔

تعلیمی حلقے مین زلفی نے ابتداء میں جو کچھ گنوایا تھا گھر کے ماحول نے اسے کسی حد پورا کر دیا تھا۔ وہ سندھ کے اپنے قبیلے والے ماحول میں نہیں رہا تھا۔ اپنے والدین کے ساتھ بمبئی میں رہنے کی وجہ سے اسے شروع سے ہی سوجھ بوجھ اور سمجھداری کی تعلیم حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ اسے وہ کچھ حاصل ہو جاتا تھا جس کی اسے ضرورت ہوتی تھی یا جو اس کی خواہش ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سرگرمیوں پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھی۔ اس آزادی سے اس کے کردار کی تعمیر میں مدد ملی۔ اس نے جدوجہد کی۔ اپنی شرارتی عادت کی وجہ سے اسے کئی مرتبہ ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ جن کی تعداد کم نہیں ہے۔

لیکن اس سے اسے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی ضرورت اور اہمیت سمجھنے میں مدد ملی۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دوستی بنائے رکھنے کی خوبی زلفی میں ہے۔

اپنے مقاصد کے لئے دوسرے لوگوں کو کام میں لانے میں زلفی بہت تیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر دوسرے لوگ اور خاص طور پر اس کے دوست اس کے ذریعہ سے اپنا کام بنانا چاہیں تو اسے ان کا ذریعہ بننے میں کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بھلے ہی اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے ذریعے وہ شخص اپنا مطلب حل کر رہا ہے۔ کئی مرتبہ زلفی لوگوں کو بیوقوف بنانے میں جب ناکام رہا تو وہ پورا قصہ بیان کرنے سے کترایا نہیں۔ یہی اس کی وہ خوبی ہے جس سے لوگوں کے دل میں اس کے لیے یقین و اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

وہ ہمیشہ چالو فیشن کے نئے کپڑے پہننے کا شوقین رہا ہے۔ اسے اس بات کا بہت خیال رہتا ہے کہ جب وہ باہر نکلتا ہے تو اس کا لباس کیسا ہوتا ہے اور اس لباس میں وہ کیسا لگتا ہے۔ لباس کے انتخاب میں وہ بڑی سمجھداری سے کام لیتا ہے۔ عام طور پر وہ کپڑے پہن کر اپنے

دوستوں کے پاس جاتا ہے اوران سے پوچھتا ہے کہ وہ کیسا لگ رہا ہے۔اگر اسے کسی جگہ تھوڑی سی دیر کے لیے جانا ہوتب بھی وہ ہوشیاری سے تیاری کرتا ہے۔لیکن اس کے لباس میں بھڑکیلا پن نہیں ہوتا تھا اور نہ اسے زیادہ چمک دمک ہی پسند تھی۔کم از کم لباس کے متعلق تو یہی بات عام لوگوں میں ہوتی ہے۔لیکن تقریر کا سوال جدا ہے۔اسے زبان کے متعلق نئے نئے تجربے کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔وہ دیکھتا تھا کہ اس کے الفاظ کیا اثر پڑتا ہے۔جب بھی ضروری ہوتا وہ بات کو خوب بڑھا چڑھا کر اور اسے غیر ضروری اہمیت دے کر بیان کرتا۔اس کا مقصد بھی اپنا اثر ڈالنا ہوتا تھا۔اس کی ان دو کمزوریوں نے مل ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا جس سے اس کے بہت سے دوست متاثر ہوئے۔یہ بات مغربی پاکستان میں ہوئی۔خاص طور پر نیا نوجوان طبقہ اس سے بہت متاثر ہوا۔

جوانی میں کپڑوں کے متعلق اس کی پسند بہت معمولی تھی۔وہ بہت عمدہ ڈھنگ کے سلے چست پتلون، کھلے سینے والی قمیض اور کھیل والے جوتے پہنتا تھا۔اس کے بالوں پر چکنائی کچھ زیادہ ہوتی تھی۔

یونیورسٹی میں زلفی زیادہ تر اسپورٹس کوٹ اور ٹائی میں نظر آتا تھا۔کبھی کبھی وہ 'بو' بھی لگاتا تھا۔لیکن وہ اس پر جچتی نہیں تھی۔کسی مخصوص موقعہ پر اس کے لباس میں سنجیدگی ہوتی تھی۔کبھی کبھی وہ بہت ہی عجیب ڈھنگ کے کپڑے پہنتا تھا اور پھر معمولی ڈھنگ اپنانے میں اسے کافی وقت لگ جاتا تھا۔ایسے موقعوں پر اکثر زوردار قہقہے لگتے تھے اور وہ مجھے تنگ کرنے کے لیے میرے کپڑے ٹائی، موزے اور جوتے پہننے لگتا تھا۔ساری چیزیں اس کے فٹ آجاتی تھیں۔اپنے کپڑوں کے متعلق وہ بہت ہوشیار رہتا تھا۔اس لیے وہ یہ بھی دیکھا کرتا تھا کہ دوسرے لوگ کیسے کپڑے پہنتے ہیں۔جب بھی اسے موقعہ ملتا تھا وہ پتی کسنے سے چوکتا نہیں تھا۔

زلفی کو من گھڑت بیان دینے میں بہت مزا آتا تھا۔ایسے موقعوں پر وہ لٹین کے بھاری بھرکم اور مشکل الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتا تھا۔بحث مباحثہ میں وہ بھڑک اٹھتا تھا۔لیکن جب صرف ہم دونوں ہی ہوتے تھے وہ اپنے نئے خیالات میرے سامنے رکھتا تھا۔لیکن جب صرف ہم دونوں ہی ہوتے تھے وہ اپنے نئے خیالات میرے سامنے رکھتا تھا اور ضد نہیں کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے ہم لوگ ایک مرتبہ سان فرانسسکو میں ایک ریستوراں میں ڈنر کے لئے گیئے۔اس کا نام گریک ویلیج تھا۔ہمیں گریک کھانے بہت پسند تھے۔کیونکہ وہ خوب مصالحہ دار ہوتے تھے۔وہاں ہماری بات چیت ہندوستان کے خوراک کے مسئلے پر آکر اٹک گئی۔زوردار بحث شروع ہوگئی زلفی کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو خوراک کی مدد نہیں دینی چاہیے۔کیونکہ اس سے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں رکاوٹ پڑتی ہے اور میرا کہنا تھا کہ لوگوں کو بھوکوں مرنے کے لیے نہیں چھوڑا جاسکتا۔اس طرح کے خیال اس کے ذہن میں آتے رہتے تھے اور زلفی کی کتاب ''دی متھ آف انڈی پینڈنس'' میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔

سماج وادی خیال اس کے دل مین یکا یک پیدا نہیں ہوئے تھے۔شروع سے ہی وہ سماج وادی (سوشلسٹ) تھا۔کم از کم زلفی کا تو یہی دعویٰ ہے۔جب میں اس سے کہتا کہ اسے مار مار کر سماج وادی (سوشلسٹ) بنایا گیا ہے تو وہ جھلا اٹھتا۔وہ غم وغصہ کے ساتھ کہتا کہ سماج واد (سوشلزم) کے ساتھ اس کا تعلق پرانا ہے، وہ سماج وادی (سوشلسٹ) اصولوں پر چلنے کا عہد کر چکا ہے اور اس کی خاص وجہ سندھ میں پھیلی ہوئی غربت کے وہ مناظر ہیں جو اس نے دیکھے ہیں۔یہ تعلق اور سپردگی انسانی قسمتوں اور حقیقتوں کا انسان کے دل ودماغ پر پڑنے والے اثر سے پیدا ہونے والے جذبہ کا انجام ہے۔اس میں شک نہیں کہ زلفی نے امریکہ اور انگلینڈ دونوں جگہ پروفیسر ہیرالڈ لاسکی کی تقریریں سنی تھیں اور ان کی زیادہ تر کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔جس میں ''دی گریمر آف پالٹکس'' نام کا مشہور ومعروف مضمون بھی شامل ہے۔لیکن بھٹو کا کہنا ہے کہ وہ پروفیسر لاسکی کی تقریریں سن کر یا ان کی کتابیں پڑھ کر سماج وادی (سوشلسٹ) نہیں بنا۔ان سب نے اس کے خیالات اور اصولوں کی تصدیق ہی

کی ہے۔ یہی بات اس دور کے سماج وادی (سوشلسٹ) مفکرین پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ زلفی کے مطابق ان سب نے اسے سماج وادی (سوشلسٹ) نہیں بنایا۔ بلکہ اس کی رائے اور خیالات کی تائید وتصدیق ہی کی ہے۔

1948ء میں زلفی نے یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں دی اسلامک ہیریٹیج پر تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ مسلم ممالک میں سماج واد (سوشلزم) کی ضرورت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ولنگڈن کلب میں لمبی بات چیت کے دوران اکثر سلفی مجھ سے کہا کرتا تھا کہ اسے پنڈت نہرو کے سماج وادی (سوشلسٹ) خیالات بے حد پسند ہیں۔ ان دنوں پنڈت نہرو ایک سماج وادی (سوشلسٹ) کی طرح ہی سوچتے اور لکھتے تھے۔ زلفی کا کہنا تھا کہ ہند کے وزیر اعظم بننے کے بعد پنڈت نہرو کے خیالات میں تبدیلی ہوئی نہیں۔ کم از کم زلفی کی تو یہی رائے تھی لیکن میری رائے اس سے جداگانہ تھی۔ میری رائے میں نہرو جی فیبین سماج وادی تھے اور آخری سانس تک فیبین سماج وادی ہی رہے۔ لوگ کچھ بھی کہیں لیکن ان میں تبدیلی آنا ناممکن تھی۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ زلفی ان دنوں سماج وادی تھا۔ میں بھی سماج وادی تیھا۔ ہم دونوں ایک ہی طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ جیسا کہ ایک عالم کا کہنا ہے کہ ''اگر بیس سال کی عمر میں آپ سماج وادی نہیں تو آپ کے پاس دل نہیں ہے اور چالیس سال کی عمر کے بعد بھی آپ سماج وادی نہیں تو پھر آپ کے پاس دل نہیں ہے اور چالیس سال کی عمر کے بعد بھی آپ سماج وادی نہیں تو پھر آپ کے پاس دماغ نہیں ہے۔'' لیکن میں ان کتابوں کا مطالعہ اپنے نظریہ کو وسیع بنانے کے لیے کرتا تھا جو مشاہدوں اور تجربوں سے پختہ ہوا تھا۔ جب کہ زلفی سماج وادی خیالات اور سماج وادی سوچ کے لیے مطالعہ کرتا تھا۔ اس میں چک نہیں کہ کئی جگہ پر یہ مطالعہ اس کے پیشتر تجربات سے میل کھاتا ہے۔ برکلے سے آکسفورڈ جانے کے بعد اور پھر مجھ سے سلسلہ قطع ہوجانے کے بعد اس کا راستہ ہمیشہ کے لیے طے ہوگیا۔

اس کے کئی سال بعد اسے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ملا۔ زلفی کو پاکستان پیپلز پارٹی کا مینی فیسٹو تیار کرنا پڑا۔ دراصل یہ بہت ہی افسوسناک بات ہے کہ اس کی صلاحیت اور کھلی سوچ کا ٹکراؤ سماج وادی کی اوپری تڑک پڑک سے ہوا اور اس میں اس نے بغیر کسی طرح کی تنقید کے یک طرفہ لگاؤ سے کام لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جذبہ بھی تھا جس میں ہندوستان پر یقین کے لئے کہیں کوئی گنجائش نہ تھی۔ پاکستان کی پیپلز پارٹی کے بنیادی دستاویز اور مینی فیسٹو میں اس نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ نرمی کی پالیسی کی بہترین روایات کے آئینہ دار ہیں لیکن سماج واد میں یقین واحترام کی جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان کی بنیاد ایسے نتائج پر ہے جن کی کوئی دلیل نہیں اور اسی سے ساری گڑبڑ پیدا ہوئی ہے۔ اپنے مضامین میں بھٹو بار بار نرمی کی پالیسی کی تشریح نہ کر کے سماج وادی نتائج کی طرف چھلانگ لگا دیتا ہے۔ ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے کہ وہ خود کو ''لبرل'' کہلانے کے بجائے سوشلسٹ کہلانا چاہتا ہے۔

زلفی کو اپنے ملک کے مغربی حصے میں کام کرنے کا وقت اور موقعہ ملا۔ یہاں اسے بڑی کامیابی ملی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی دریغ نہیں کہ اگر اسے موقعہ ملا ہوتا تو وہ بنگال میں بھی اسی قدر کامیاب ہوا ہوتا جس قدر پنجاب میں ہوا۔ وہ خود سندھی ہے۔ زبان نہ جاننے کی وجہ سے شاید بنگال میں عوام سے رابطہ قائم کرنے میں اسے دشواری کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ دشواری مغربی پاکستان میں نہیں تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ زلفی بنگال میں زبان کی دشواری پر قابو پانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیتا۔

زلفی ہمیشہ سے یہ سوچا کرتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ کسی بہت اونچے عہدے پر پہنچے۔ اس کے تمام کام اور خیال اسی مقصد کی جانب بڑھنے کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ 1947ء سے 1950ء تک ہم لوگ امریکن ماحول میں رہے۔ ان دنوں تمام دنیا کی امیدیں یو۔این سے وابستہ تھیں کیونکہ اس میں دنیا میں امن بنائے رکھنے کی طاقت تھی ان دنوں زلفی خود یو۔این۔او میں اپنے ملک کا نمائندہ ہونے کا

خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا۔لیکن بعد میں ایسا ہی ہوا۔زلفی کو یو۔این۔او میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کا موقعہ ملا۔لیکن جیسے جیسے یو۔این۔او کی طاقت میں کمی آتی گئی زلفی نے اپنی نظر اس پر سے ہٹالی ہوگی اور داخلی پالیسی اور اصولوں کی بابت زیادہ سے زیادہ غور کرنا شروع کر دیا ہوگا۔

انہیں دنوں گرمیوں کی چھٹیوں میں جب زلفی برکلے میں تھا اس نے محسوس کیا کہ حکومت چلانے کے لیے اسے شرکاری کام کاج اور حکومت چلانے کی عملی ٹریننگ کی ضرورت ہے اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے واشنگٹن کے پاکستانی سفارت خانہ میں جائیگا۔

اتفاق سے میرے والدین ان دنوں امریکہ آئے ہوئے تھے۔اس لیے مجھے بھی واشنگٹن جانا پڑا۔جب وہ ہندوستان واپس چلے گئے تو میں نے باقی چھٹیاں واشنگٹن میں ہی زلفی کے ساتھ گذاریں۔چھٹیاں ختم ہونے پر میں کیلیفورنیا واپس آیا۔ان دنوں واشنگٹن میں اس قدر گرمی تھی کہ کھانے تک کو جی نہیں چاہتا تھا۔نتیجہ یہ تھا کہ ہم لوگ صبح سے ہی شیمپین کا ک ٹیل پینا شروع کر دیتے تھے اور اس فضول خرچی کی وجہ سے ہمارے پاس کھانے کے لیے بہت کم پیسے رہ جاتے تھے۔

جب اس طرح بامقصد کام کرتے ہوئے زندگی کو معقول ڈھنگ سے ڈھالا جائے تو اس کے نتائج ہمیشہ ہی بہتر اور شاندار ہوتے ہیں۔جنھیں کھویا نہیں جاسکتا۔کچھ عرصہ کے بعد ہی زلفی نے حکومت پاکستان میں مقام حاصل کرلیا اور بڑی مضبوطی کے ساتھ جوش وخروش سے دن بہ دن اپنے طے شدہ مقاصد کی طرف بڑھنے لگا۔جو کچھ اس نے چاہا تھا پالیا۔وہ اپنی خواہشات کی چوٹی پر پہنچ گیا۔اپنے 44ویں جنم دن (سال گرہ) سے پیشتر ہی 20دسمبر 1971ءکو وہ پاکستان کا صدر بن گیا۔

ساتواں باب

زلفی کی آمد

اونچی تعلیم کے لیے انگلینڈ پہنچنے کے بعد زلفی نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں قانون کا مطالعہ شروع کیا۔ کرائیسٹ چرچ کالج میں داخل ہو کر اس نے تین سال کے کورس کو دو سال میں ہی مکمل کر لیا اسے اس امتحان میں بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ چند نمبروں سے اس کا فرسٹ کلاس رہ گیا۔

رومن قانون کا بیشتر حصہ لیٹن میں ہے۔ ڈگری حاصل کرنے کے لیے رومن قانون پاس کرنا لازمی تھا۔ بھٹو کو لیٹن آتی نہیں تھی اور آکسفورڈ میں رومن قانون کا معیار بہت بلند ہے۔ اس لیے جب اسے رومن قانون میں سکینڈ کلاس ملا تو یہ ایک کرشمہ ہی تھا۔ جیسا کہ اس نے بعد میں تسلیم کیا اسے سوتے جاگتے لیٹن کے ہی خواب رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ زلفی کو یہ زبان حفظ کرنے میں بہت سخت محنت کرنی پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے زبانوں کو سیکھنے سے نفرت ہو گئی اور وہ نفرت آج بھی بدستور قائم ہے۔

اسے لیٹن سیکھنے کا بہت مشکل کام کرنا پڑا اور ساتھ ہی سارا کورس دو سال میں پورا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود بھٹو نے اپنی تمام چھوٹی موٹی چھٹیاں اور لمبی چھٹیاں پاکستان میں گزاریں۔ اسی دوران اس نے پاکستان میں ستمبر 1951 میں نصرت کے ساتھ شادی کی۔ اسے اپنے تمام وقت کو تعلیم اور دنیا کو دیکھنے میں صرف کرنا تھا۔ اس لیے اسے ''مجلس'' جیسے ادارہ اور آکسفورڈ یونین میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں وہ کبھی کبھی یونین کے آفس میں ضرور چلا جاتا تھا۔

1952 میں آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد زلفی قانون کے امتحان دینے کے لیے لنکنز ان لندن گیا۔ ایک سال کے اندر ہی وہ وکیل بن گیا اور اسے ساؤتھمپٹن یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کے پروفیسر کا عہدہ مل گیا۔ لیکن وہ پروفیسر کے فرائض انجام نہ دینے پایا۔ کیونکہ اس کے والد سخت بیمار پڑ گئے اور اسے پاکستان واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے کنگز کالج کیمبرج میں داخلہ لیا تا کہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ لیکن والد کی علالت کی وجہ سے اس کا کیمبرج جانا بھی ممکن نہ ہو سکا۔ امتحان دینے کے بعد زلفی نے انگلینڈ کی ملکہ کے مشیر اور مشہور وکیل ایش لنکن کے ساتھ کام کیا۔ نومبر 1953 میں بھٹو کو اپنے گھریلو کاموں کی دیکھ بھال کے لیے پاکستان واپس آنا پڑا۔

والد کی لمبی علالت اور اپنے بھائی سکندر علی خان کی لاپروائی کی وجہ سے زلفی کی گھریلو جائداد کی حالت بہت ہی خستہ تھی۔ گھر پہنچتے ہی زلفی نے جائداد کی دیکھ بھال اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ زلفی لاڑکانہ اور جیکب آباد ضلعوں میں پھیلی زمینداری کو سنبھالنے میں ہی اپنا وقت ضائع کرنے لگا بلکہ اس کے ساتھ اس نے وکالت کرنے کے لیے کراچی میں دفتر بھی کھول لیا۔ کام سیکھنے کے لیے اس نے مسٹر رام چندانی کو اپنا سینیئر بنایا۔ وہ دیوانی اور فوجداری کے بہت ہی اچھے وکیل تھے۔ لیکن رام چندانی نے دیکھا کہ ان کا یہ اسسٹنٹ ایک دن ان کا مقابل بن سکتا ہے کیونکہ وہ بہت ہی بلند خواب دیکھتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے شاگرد کو کوئی ٹریننگ نہیں دی۔ بلکہ جہاں تک ہو سکا یہی کوشش کی کہ زلفی وکالت کے پیشے کو نہ اختیار کرے۔ انہوں نے زلفی کا حوصلہ پست کرنے کی بہت کوشش کی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ وکالت میں اپنا وقت ضائع نہ کر کے سیاست کی طرف توجہ دے جس کے لیے وہ بے حد معقول ہے۔

بھٹو رام چندانی کا مقصد سمجھ گیا۔ اس نے ان سے الگ ہو کر اپنا ذاتی دفتر کھول لیا اور دیوانی و فوجداری مقدموں کے مقامی طریقے سے وکالت کا کام کر سکے۔

اتفاق کی بات کی بات ہے کہ زلفی نے جو پہلا مقدمہ لیا۔ اس کی شنوائی پاکستان ہائی کورٹ کی سندھ چیف کورٹ کی پوری بینچ کے

سامنے ہوئی۔ان دنوں کانسٹینٹائن نام کے ایک انگریز چیف جسٹس تھے۔جب بھٹو نے مقدمے کی دلیلیں اور پیروی ختم کی تو چیف جسٹس نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔انہوں نے کہا کہ میں عدالت میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ زلفی کا شمار جلد ہی پاکستان کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگے گا۔یہ بات زلفی کو بہت اچھی لگی۔سچ تو یہ ہے کہ زلفی کو اپنی تعریف سن کر یا شاباشی پا کر بہت خوشی ہوتی ہے۔جس کی کوئی حد نہیں ہے۔

بھٹو نے اور بھی کئی پیچیدہ مقدمے اپنے ہاتھ میں لیے۔قتل کے مقدموں کی جتنی بھی اپلیں آئیں۔سب میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔کسی بھی اپیل میں اسے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ایک مقدمے میں تو اس کے مقابلے میں پاکستان کے بڑے بڑے وکیل تھے۔یہ مقدمہ چانڈیو قبیلے کی وراثت کے متعلق تھا اور بے حد پیچیدہ مقدمہ تھا۔اس قبیلہ کے سردار کے پاس زمین کی چک بندی ہونے سے پہلے ہند اور پاکستان میں بہت بڑی جاگیر تھی۔بھٹو کو اس مشہور مقدمے میں بھی کامیابی حاصل ہوئی۔ادھر لاڑکانہ اور جیکب آباد کی جائداد کی ذمہ داریاں اسے پریشان کر رہی تھیں اور ادھر وکالت کے کام میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔موکل بھٹو کے پاس آتے اور اس کے دفتر میں تالا لگا دیکھتے۔ اس کے مخالف وکیل اس کے خلاف یہ افواہ پھیلاتے ہوئے نہ تھکتے تھے کہ بھٹو نے وکالت چھوڑ دی ہے۔زلفی نے محسوس کیا کہ سیاست کی طرح وکالت بھی ایک ایسی بیوی ہے جو انتہائی حاسد ہے جو کسی ''سوت'' کو برداشت نہیں کر سکتی۔سارا وقت خود ہی چاہتی ہے۔

1956 کے انہیں دنوں میں زلفی کو جب بھی وقت ملتا وہ سندھ مسلم کالج میں آئین جہانداری پڑھانے کے لیے کراچی جانے لگتا۔ برکلے میں طالب عالم کی حیثیت سے اس نے پروفیسر ہنس کیلسن پروفیسر پسکی سے جو علم حاصل کیا تھا اسے زلفی کس طرح سندھ مسلم کالج کے طلبہ کے ذہن میں انڈیلتا ہوگا میں اس کا قیاس کر سکتا ہوں۔

ایک طرف تو وہ اپنی زمین جائداد کے متعلق ذمہ داریوں کو پورا کرتا تھا۔دوسری طرف عدالت اور وکالت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ زلفی سیاسی تحریکوں کے بھنور جال میں بھی پھنس گیا جو مغربی پاکستان میں مختلف صوبوں کو ختم کرنے کے سرکاری فیصلے کی وجہ سے شروع ہوئی تھیں۔ پاکستان سرکار نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ختم کر کے ایک صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔یہ فیصلہ اس قدر اہم تھا کہ اس کے نتیجے کا اثر دور تک پڑتا۔اس کی وجہ سے سرکار کے خلاف ایک زبردست مخالفت ابھر آئی۔بھٹو نے محسوس کیا کہ وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح اس صورت حال کو دیکھتا نہیں رہ سکتا۔وہ سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑا۔زلفی کو سندھ یوتھ فرنٹ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔اس نے ایک صوبے کی تعمیر کی سخت مخالفت کی۔اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پمفلٹ بھی لکھا جس کا نام تھا'' پاکستان متحدہ صوبائی ملک ہے یا ایک صوبائی۔'' صوبہ سندھ کی حکومت ان دنوں فرو کے ہاتھ میں تھی۔انہوں نے زلفی کی گرفتاری کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا۔لیکن سندھ کی سیاست میں بھٹو گھرانے کا کافی اثر تھا اور زلفی کے والد کی ایک بہت بڑے سیاست دان کی حیثیت سے بہت عزت تھی۔انہیں سندھ کی تعمیر کرنے والا تسلیم کیا جاتا تھا۔کیونکہ انہیں کی وجہ سے سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کر کے ایک الگ صوبہ بنایا گیا تھا۔ان کا اس قدر مخصوص مقام ہونے کی وجہ سے زلفی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔

زلفی کو کئی مرتبہ خبردار کیا گیا اور معمولی باتوں میں اسے پریشان کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔جب یہ تحریک ختم ہوئی تو زلفی کے والد نے محسوس کیا کہ زلفی پر سیاست کا ایک دائمی نشہ چڑھ چکا ہے۔سر شاہنواز نے زلفی سے کہا کہ یہ مناسب ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لے۔یہی نہیں انہوں نے یہ بھی تسلیم یا کہ انہوں نے زلفی کو سیاست کی تعلیم دی ہے اور انہیں امید ہے کہ زلفی

سیاست میں ایک اہم رول ادا کرے گا۔لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ سیاست میں وقت کی بہت ہی زیادہ اہ9میت ہے۔اگر

زلفی وقت سے پہلے ہی سیاست میں کود پڑا تو سخت غلطی کرے گا۔ ایسی غلطی جس کو بھی درست نہ کیا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ زلفی نے صوبائی انتخابات میں حصہ نہیں لیا اور نہ سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کی۔ بعد میں زلفی نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس پر جو بندشیں عائد کی گئیں ان سے اسے سخت تکلیف ہوئی۔

1956 تک زلفی اپنا زیادہ سے زیادہ وقت زمین جائیداد کے انتظام میں صرف کرتا رہا لاڑکانہ میں اس کا ایک دادائی مکان تھا۔ جہاں اس کے والد کے پاس موتی لال نہرو اور قائداعظم محمد علی جناح ٹھہر چکے تھے اور بھی بہت سی میٹھی یادیں اس مکان کے ساتھ وابستہ تھیں گھر کے دوسرے لوگوں کی مخالفت کے باوجود یہ مکان زلفی نے گروا دیا۔

اس مکان کی جگہ زلفی نے ایک نیا مکان تعمیر کرایا۔ جو 1955ء میں بن کر تیار ہوا۔ اس کے بعد سے وہ زیادہ تر لاڑکانہ میں ہی رہنے لگا۔ اس نے اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ پھر سے راہ و رسم بڑھائی۔ نئے نئے دوست بنائے۔ لاڑکانہ سے کراچی کے بجائے جیکب آباد جانا زیادہ آسان تھا۔ اس لیے وہ بار بار جیکب آباد جانے لگا۔ اس ضلع میں اس کے خاندان کے کافی رشتہ دار تھے ان کے ساتھ اس نے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔ زمین جائیداد کا انتظام صحیح ڈھنگ سے ہونے کی وجہ سے بہت منافع ہوا۔ زلفی نے ٹریکٹر خریدے اور نئے طریقے سے کھیتی کرانا شروع کر دیا۔

1950ء کے موسم گرما کے بعد نہ تو زلفی کے متعلق مجھے کوئی خبر ہی موصول ہوئی اور نہ زلفی سے میری ملاقات ہی ہوئی۔ ہم لوگ 1950ء میں برکلے سے جدا ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کسی ایسے شخص سے ملاقات ہو جاتی جو زلفی سے ملاقات کر کے آیا ہوتا تھا وہ مجھے اس کی بابت بتاتا اور کہتا کہ اس نے آپ کے لیے سلام بھیجا ہے۔ اسی دوران زلفی کو کراچی میں مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ لوگ اسے ایک ہونہار سیاست دان تصور کرنے لگے۔

جن دنوں زلفی انگلینڈ میں تھا اور آکسفورڈ میں اور لنکنز ان میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ان دنوں میں چندی گڑھ میں لاکار بوزے جیزٹ، فرائی اور ڈرو کے ساتھ چندی گڑھ کی تعمیر کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ 1953ء میں فن تعمیر کی ڈگری لے کر میں بمبئی واپس آ گیا تھا۔ تقریباً انہیں دنوں زلفی وکالت شروع کرنے کراچی پہنچا تھا۔

زلفی نے بڑی آسانی سے عوام کے درمیان اپنا مقام بنا لیا۔ اسکندر مرزا بھٹو گھرانے کے پرانے دوست تھے۔ جن دنوں زلفی کے والد بمبئی پریذیڈنسی میں وزیر تھے مرزا کے چاچا ان دنوں بمبئی میں انجینئر کے عہدے پر تھے۔ مرزا کے چاچا اور زلفی کے والد میں گہری دوستی تھی۔ زلفی کی ملاقاتیں صدر اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان سے اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ یہ ملاقاتیں موسم سرما میں لاڑکانہ میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ ان دنوں یہ دونوں سیاست دان وہاں جاتے تھے۔ ان کی ملاقات زلفی کے والد سے اکثر ہوتی تھی۔ وہ ان لوگوں کو دوپہر یا رات کے کھانے پر بلاتے تھے۔ یہ لوگ زلفی کے چاچا کے ساتھ اکثر شکار کھیلنے
جاتے تھے۔ پاکستان میں ان کے پاس سب سے زیادہ شاندار شکارگاہ تھی۔

ایک مرتبہ اسکندر مرزا کے ساتھ زلفی کی بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ یہ بات 1955ء کے آخری دنوں کی ہے۔ صدر اس بات چیت سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ سیکورٹی کونسل میں جب کشمیر کے مسئلہ پر بحث ہو تو پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے زلفی کو وہاں بھیجا جائے۔

ان دنوں چوہدری محمد علی پاکستان کے وزیراعظم تھے۔ اسکندر مرزا نے ان سے کہا کہ بھٹو کو ڈیلیگیشن میں شامل کر لیا جائے۔ چوہدری

محمد علی نے بھٹو کا قریب سے مطالعہ کرنے کے لیے اسے اپنے پاس بلایا۔ بدبختی سے بھٹو انہیں لمبی بات چیت کے بعد بھی متاثر نہیں کر سکا کیونکہ زلفی اور چوہدری محمد علی کے درمیان اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ سیکورٹی کونسل میں کشمیر کے مسئلہ پر بحث کس طرح کی جائے اس کے ساتھ ہی کچھ گھریلو سیاسی مسئلوں پر بھی اختلاف ہو گیا۔ چوہدری محمد علی نے اسکندر مرزا سے صاف صاف کہہ دیا کہ سیکورٹی کونسل میں کشمیر کے مسئلے پر بحث کے لیے پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے زلفی کو نہیں بھیجا جا سکتا۔ وہ اس معاملے میں ابھی بہت کچا ہے۔

چند ماہ بعد اسکندر مرزا نے زلفی کو کراچی بلایا۔ انہوں نے زلفی سے کہا کہ میں چوہدری محمد علی سے سخت خفا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے تمہیں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے سیکورٹی کونسل میں نہیں بھیجا۔ لیکن چونکہ وہ وزیر اعظم ہیں اس لیے میں ان کی بات کاٹ نہیں سکتا۔ اسکندر مرزا نے زلفی سے وعدہ کیا کہ ستمبر 1956ء میں جب اقوام متحدہ کی بیٹھک ہو گی تب اسے امریکہ ضرور بھیجا جائیگا۔

چند دنوں کے بعد حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بن گئے۔ اس سے پہلے 1955ء میں انکے مکان پر زلفی اور شیخ مجیب الرحمان کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ سہروردی نے اس وجہ سے زلفی کا نام 1956ء میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں جانے والے ڈیلیگیشن کی لسٹ میں سے نہیں کاٹا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی۔ کہ سہروردی نے زلفی سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو جائے لیکن زلفی نے ہر مرتبہ ان کی پیش کش نامنظور کر دی تھی۔ اس وجہ سے سہروردی زلفی سے ناراض تھے۔

دراصل ایک مرتبہ سہروردی زلفی کے گھر گئے اور انہوں نے زلفی کے والد سے کہا کہ وہ زلفی سے کہیں کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو جائے۔ لیکن زلفی کے والد نے کہا کہ زلفی کو اس بات کی مکمل آزادی ہے کہ وہ جس پارٹی میں بھی چاہے شامل ہو سکتا ہے اور والد کی حیثیت سے وہ اپنا کوئی فیصلہ ماننے کے لیے زلفی کو مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کے اس جواب میں سہروردی کو اپنی توہین نظر آئی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر زلفی کے والد چاہتے تو زلفی عوام لیگ میں ضرور شامل ہو جاتا۔

شاید اسی وجہ سے سہروردی زلفی پر چوٹ کرنا چاہتے تھے اور اسی لیے انہوں نے اقوام متحدہ بھیجے جانے والے ڈیلیگیشن کی لسٹ میں سے زلفی کا نام کاٹ دیا۔ اسکندر مرزا کو بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔ 1956ء کی سردیوں میں جب وہ
لاڑکانہ گئے تو انہوں نے صفائی دینے کی بہت کوشش کی مگر ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے حد شرمندگی محسوس کر رہے ہیں۔ یہ بات اردگرد کے سبھی لوگوں نے محسوس کی۔ زلفی نے فوراً کہا کہ ایسے ڈیلیگیشنوں میں جانا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ جب وقت آئے گا اسے خود بخود اس طرح کے ڈیلیگیشنوں میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس سوال کو لے کر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

1957ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کو ختم کر دیا گیا۔ صدر اسکندر مرزا نے پیشکش کی کہ زلفی کراچی کارپوریشن کے میئر کی حیثیت سے کارپوریشن کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن بھٹو نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں ایسے عہدے پر کام نہیں کرنا چاہتا جس کا انتخاب کیا جاتا ہو۔ اس کے علاوہ سندھ کے اندرونی علاقوں کے کاموں میں وہ اس قدر مصروف تھا کہ کراچی کارپوریشن کے لیے اپنا سارا وقت نہیں دے سکتا تھا۔

ستمبر 1957ء میں سہروردی کے وزیر اعظم ہوتے ہوئے ہی زلفی کو پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں پاکستانی ڈیلی گیشن کے ساتھ بھیجا گیا۔ اس مرتبہ وزیر اعظم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ زلفی کی عمر اس وقت 29 سال کی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ کی چھٹی کمیٹی میں ''حملہ کی تعریف'' پر ایک تقریر کی جسے آج بھی کچھ حلقوں میں اس موضوع پر ایک شاندار تقریر تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ چند لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

جب بھٹو اقوام متحدہ میں تھا تب ہی 1957ء میں 19 نومبر کو لاڑکانہ میں سر شاہنواز انتقام فرما گئے۔ والد کی موت کے بعد پیدا ہونے والے مسئلوں کو حل کرنے کے لیے بھٹو کو اسی وقت امریکہ سے واپس پاکستان آنا پڑا۔ کوئی بہت پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا اور نہ کوئی گھریلو جھگڑا تھا۔ اس لیے دو مہینے کے اندر ہی وراثت سے متعلق تمام مسئلے حل ہو گئے۔ ذوالفقار کی سبھی بہنوں اور بڑے بھائی سکندر نے اس سے اصرار کیا کہ وہ پہلے کی طرح ہی زمین جائیداد کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ انہوں نے خاندان کی برتری اور خوشحالی کی ذمہ داری بھی اسی کے کندھوں پر ڈال دی۔

مارچ 1958ء میں جب فیروز خان نون پاکستان کے وزیر اعظم تھے تو بھٹو کو پاکستانی ڈیلیگیشن کے لیڈر کی حیثیت سے جنیوا میں اقوام متحدہ کے بحری قوانین کے متعلق ہونے والے اجلاس میں بھیجا گیا۔ اس اجلاس میں زلفی نے بہت ہی شاندار طریقے سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ کئی ملکوں کی سرکاروں نے پاکستان سرکار کو لکھ کر زلفی کے کام کی تعریف کی۔ امریکہ کے وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلیس نے بھی بہت تعریف کی۔

اسکندر مرزا اور ایوب نے جب حکومت کا تختہ پلٹ دیا تو سرکار چلانے کے لیے ایسے ذہین اور سوجھ بوجھ والے لوگوں کی تلاش شروع ہوئی جن کا فوج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہر سرکار ہمیشہ ہی یہ کوشش کرتی ہے کہ سرکار میں ہر صوبے کی نمائندگی رہے۔ سندھ کی نمائندگی کے لیے جب نظر دوڑائی گئی تو یہ مناسب سمجھا گیا کہ انتخاب چند بارسوخ گھرانوں میں سے کیا جائے
ذوالفقار علی بھٹو سب سے زیادہ لائق نظر آئے۔

بھٹو گھرانے میں ذوالفقار علی سیب سے زیادہ لائق اور ذہین تھے۔ ان کے والد لندن میں 32-1931ء میں گول میز کانفرنس میں گئے تھے۔ بمبئی سرکار میں انہوں نے سندھ کے نمائندہ کی حیثیت سے وزیر کے عہدے پر کام کیا تھا۔ وہ بمبئی پبلک سروس کمیشن آف سندھ کے صدر رہ چکے تھے۔ سندھ حکومت کے خاص صلاح کار بھی رہے تھے۔ بعد میں انہیں جوناگڑھ کا دیوان بنا دیا گیا تھا۔ اس طرح بھٹو کا ایک قدرتی سیاسی پس منظر بھی تھا۔ تعلیم اور کاروباری نقطۂ نگاہ سے بھی بھٹو میں ضروری قابلیت اور صلاحیت تھی۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب سندھ میں قابل لوگوں کی تالش ہوئی تو بھٹو پر ہی سب کی نظر گئی۔ یہی نہیں بلکہ بھٹو کو حکومت کا کچھ تجربہ بھی تھا۔ وہ اقوام متحدہ کے بارہویں اجلاس میں پاکستانی ڈیلی گیشن کا ممبر تھا۔ فروری 1958ء میں وہ جنیوا میں ہوئے بحری قوانین کے متعلق اقوام متحدہ کی کانفرنس میں پاکستانی ڈیلی گیشن کا صدر بھی رہ چکا تھا۔

بھٹو کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جو بھی کام کرتا ہے اسے دل سے کرتا ہے اسے دل سے کرتا ہے۔ ان دونوں موقعوں پر بھی اس نے بہت محنت کی تھی۔ متعلقہ مراعات کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ دلائل اور حقیقتوں کو خوب اچھی طرح سمجھ کر حفظ کر لیا تھا اور بڑی ہوشیاری سے اپنے ملک کی بہتری اور سلامتی کا خیال رکھا تھا۔

یہ بات سننے میں کچھ عجیب ضرور محسوس ہوگی۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بھٹو ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو دوسروں کو ٹھیل کر یا کہنی مار کر خود آگے آجاتے ہیں۔ اپنی تعلیم اور عادات کی وجہ سے بھٹو اپنے سے بزرگ اور سینئر لوگوں کا بہت احترام کرتا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اس کی تعلیمی قابلیت، ذاتی تعلقات اور اقوام متحدہ میں شاندار کام ان سب کی وجہ سے بھٹو کو ایوب وزارت میں وزیر تجارت مقرر کیا گیا۔

اپنی وزارت کے شروع کے زمانے میں بھٹو کی یہ کوشش نہیں تھی کہ وہ اپنا کیریئر بنائے بلکہ اس کی کوشش یہی رہی کہ وہ اپنے عہدہ سے ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ ''دی اسٹیٹ آف پاکستان'' نام کی کتاب میں ایل، ایف، رس برک ولیمز نے اس کی بابت تحریر فرمایا ہے:
''بعد میں انہیں (حفیظ الرحمٰن کو) تجارتی وزارت کا کام سونپا گیا۔ پہلے یہ محکمہ ذوالفقار علی بھٹو کے قابل ہاتھوں میں تھا۔ جو سیاست

میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ لیکن جناب بھٹو نے ماہرین اقتصادیات کے درمیان اپنا ایک مخصوص اور قابل احترام مقام بنالیا تھا۔ بعد میں انہوں نے ایندھن، بجلی اور قدرتی زرائع کے وزیر کا عہدہ سنبھالا اور محمد علی بوگرہ کی وفات کے بعد وزیر خارجہ بنے''۔

1953ء کے بعد سے زلفی کی زندگی کے متعلق پڑھنے اور کھوج کرنے پر مجھے ایسی ایک بھی مثال نہیں ملی۔ جب بھٹو نے کسی ایسی چیز کی مانگ کی ہو جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی قابلیت اور اہلیت ثابت نہ کر دی ہو۔ عہدہ کے لالچ میں
اس نے پاکستان کے لیے کسی اہم بنیادی مسئلے پر اپنے ٹھوس اصولوں سے دگمگا کر کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

اس بات کے بے شمار ثبوت ہونے کے باوجود مرزا اور ایوب کے فوجی انقلاب کے بعد سرکار میں بھٹو کے وزیر بنائے جانے پر طرح طرح کے خیالی گھوڑے لوگوں نے دوڑائے۔ لندن آبزرور نے اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے لیے 6 جنوری 1962ء میں کیے گئے شکار کے اہتمام کے متعلق لکھا ہے۔ یہ اہتمام بھٹو نے کیا تھا۔ ممکن ہے اس سازش میں بھٹو بحیثیت میزبان کے ہی شامل نہ ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس سازش کی بنیاد اسی شکار کے دوران رکھی گئی تھی۔ جو بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ بھٹو سے مرزا اور ایوب دونوں ہی خوش تھے اور اس لیے اسے وزارت میں شامل کرنے کے لیے کسی کو کسی سے کچھ زیادہ کہنا سننا نہیں پڑا۔

زلفی کو اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی کہ اس کا تعلق کسی ایسے طبقہ سے ہے جسے کچھ مخصوص حق اور رتبہ حاصل ہے۔ اس نے حقیقت کو نمایاں کرتے ہوئے اپنی اس حالت سے حاصل ہونے والے مفاد کی تشریح کی ہے۔ 10 جولائی 1962ء کو نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

''میں اسی سماج اور طبقے کا ایک جز ہوں۔ آج ایک وزیر کی حیثیت سے یہاں مجھے تقریر کرنے کا جو موقعہ حاصل ہوا ہے اس کی بھی شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس مخصوص طبقے اور سماج کا ایک حصہ ہوں جسے مخصوص حقوق حاصل ہیں۔ اس لیے اس سے حاصل ہونے والے مفاد کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ ہم میں سے بیشتر لوگ اس نظام کی سلامتی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ اس نظام میں بے شمار عیب ہیں۔ خامیاں ہیں۔ یہ نظام وہ ہے کہ جہاں خطرناک سمجھوتے اور سازشیں ہوتی ہیں۔ جن سے عوام کو نقصان پہنچتا ہے۔ لوگوں کی غربت کی طرف سے وہ آنکھ موند لیتے ہیں۔ اس سے کاہلی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے دو ممبر جب آپس میں بھڑتے تھے تو عوام کی غربت بدستور قائم رہتی تھی۔ ترقی کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ کل کارخانوں کی تعمیر نہیں ہوتی۔ سڑکیں نہیں بنتیں۔ آنے جانے اور پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ مکمل تاریکی، غربت اور تکلیفیں پھیلی ہوئی تھیں۔ صرف چند بڑے بڑے لوگ، چند چنیدہ لوگ خوش حال بن پاتے تھے۔ یہ مغرور غریب اور تکلیفیں پھیلی ہوئی تھیں۔ صرف چند بڑے بڑے لوگ، چند چنیدہ لوگ خوش حال بن پاتے تھے۔ یہ مغرور زمین دار کن مسئلوں کو حل کرنے کے لیے آگے آتے تھے؟ کیا وہ مظلوموں کی بہتری کی بات کبھی سوچ سکتے تھے؟''

ایوب وزارت میں ایک وزیر کی حیثیت سے پہلی مرتبہ اکتوبر 1958ء سے جنوری 1960ء تک وزیر تجارت کے عہدے پر اور اس کے بعد امور اقلیت، قومی تعمیرات اور اطلاعات کے وزیر کے عہدے پر زلفی نے کام کیا۔ بعد میں نیچرل گیس، ایندھن، بجلی اور امور کشمیر کی نئی وزارت کا کام سنبھالا۔ ان سبھی عہدوں پر بھٹو نے بہت اچھی طرح کام کیا۔ کام کرتے وقت اس میں کچھ تجربہ حاصل کرنے اور سیکھنے کا جذبہ رہتا تھا۔ جب ایوب وزارت میں نئے آئین کے تحت اسے پھر وزیر بنایا
گیا تو اسے وزیر خارجہ کا عہدہ دیا گیا۔ جس عہدے کی خواہش اسے ایک مدت سے تھی آخر وہ اسے مل ہی گیا۔ وہ جب تک وزیر رہا اس نے نہایت ایمانداری، احترام اور دلی عزت و وفاداری کے ساتھ اپنے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔

جب 1965ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ ہوئی اور پھر تاشقند سمجھوتا ہوا تو ایوب اور بھٹو کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ چند باتیں بھٹو کے خیالات اور اصولوں کے قطعی خلاف تھیں۔ ایوب سے اختلاف ہو جانے کے بعد بھٹو کچھ وقت کے لیے بالکل بیٹھ گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے تاشقند قرارداد سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن اصلی وجہ یہ تھی کہ اس سے ایوب کا یقین اٹھ گیا تھا اور انہوں نے زلفی سے صلاح مشورہ کرنا بند کر دیا تھا۔ بھٹو نے کئی مرتبہ استعفا دینے کی پیش کش کی اور دھمکی بھی دی کہ وہ استعفا دے دیگا۔ لیکن ایوب نے طے کر رکھا تھا کہ جب اس کی مرضی ہوگی تب وہ زلفی کو نکالے گا۔ دراصل ایوب نے بھٹو کو بلا کر کہہ دیا تھا کہ اگر بھٹو نے بات بڑھانے کی کوشش کی تو اس کے سخت اور خطرناک نتائج اسے بھگتنے ہوں گے۔ آخر میں ایوب نے بھٹو کو زبردستی بیماری کی چھٹی دے کر لندن بھیج دیا اور اس طرح اسے اپنی وزارت سے نکال دیا۔

تاشقند اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں بدامنی پھلنی شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ بھٹو تقریباً خاموش ہی رہا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ خوش تھا کہ ایک ایسی تحریک شروع ہوگئی تھی جس کے بعد اسے سب سے اونچا عہدہ ملنے کی امید تھی۔

اپنی وزارت سے برطرف کر دینے کے بعد ایوب نے دیکھا کہ بھٹو پر قابو رکھنا روز بہ روز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ بھٹو کو تنگ کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ بھٹو کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ ایک مرتبہ ایوب نے بھٹو کے قتل کی سازش بھی کی تھی اور اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے اس نے چند لوگوں کو اس سازش میں شامل کیا۔ محکمہ خفیہ پولیس اور دیگر سرکاری افسروں کو بھٹو، اس کے خاندان کے لوگوں اور اس کے دوستوں کے خلاف کاروائی کرنے کی ہدایت دے دی۔ ایک مرتبہ تو ایوب سرکار نے نیشنل اسمبلی میں یہاں تک اعلان کر دیا کہ بھٹو درحقیقت پاکستانی نہیں ہندوستانی ہے۔

بھٹو کے بزرگوں کے زمانے کے اور اس کے خاندان کے دیگر ہتھیاروں کو ضبط کر لینے کی کئی کوششیں کی گئیں۔ یہ بھی کوشش کی گئی کہ بھٹو، اس کے رشتہ داروں اور وفادار نوکروں کی زمینوں پر سرکاری قبضہ کر لیا جائے۔

آٹھواں باب

عکس اور پرچھائیاں

بھٹو کی داستان اب 1958ء تک آ چکی ہے۔ اس لیے اس دوران جو واقعات پیش آئے اور جن لوگوں کا طوطی پاکستان میں بول رہا تھا ان کے متعلق کچھ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ یوں تو ان کے متعلق پاسکتان اور ہندوستان میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم ذیل میں ایسے لوگوں کے خاکے پیش کیے جا رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کی بابت زلفی کی کیا رائے تھی۔ بعد کے برسوں میں زلفی سے جو میری بات چیت ہوئی اس کی یادداشت کی بناء پر میں نے یہ خاکے مختصر الفاظ میں پیش کیے ہیں۔

زلفی کا کہنا تھا کہ غلام محمد پاگل تھا۔ اسے حکومت سے ازحد محبت تھی اور اس کی سوچ نوکر شاہوں جیسی تھی۔ اس نے غیر قانونی طریقے سے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو برخاست کر کے آمریت کے لیے راہ بنائی۔ ٹاٹا کمپنی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے میرے والد اس سے بخوبی

واقف تھے۔

بھٹو کا خیال ہے کہ خواجہ ناظم الدین بہت ہی شریف لیکن کمزور شخص تھے، ان کی کسی بھی بات کو لوگ بلا تنقید کیے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ مشرقی پاکستان کے تھے اور ان کا کردار بے داغ نہیں تھا۔

بھٹو کے خیال کے مطابق سر فیروز خان نون زمیندار تھے اور اپنے عہدے کے قابل نہیں تھے۔ وہ مسئلوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے تھے لیکن وہ شریف تھے۔ قسمت سے ہی انہیں وزیر اعظم کا عہدہ نصیب ہوا تھا۔ قسمت نے کئی مرتبہ ان کا ساتھ دیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ وہ مشرقی پاکستان کے تھے اور ان کا کردار بے داغ نہیں تھا۔

بھٹو کے خیال کے مطابق سر فیروز خان نون زمیندار تھے اور اپنے عہدے کے قابل نہیں تھے۔ وہ مسئلوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے تھے لیکن وہ شریف تھے۔ قسمت سے ہی انہیں وزیر اعظم کا عہدہ نصیب ہوا تھا۔ قسمت نے کئی مرتبہ ان کا ساتھ دیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس قدر خطرناک سازشی نہیں تھے جس قدر ان کے دور کے دوسرے لوگ تھے۔

زلفی کے مطابق سہروردی دیگر سیاست دانوں کی نسبت کہیں زیادہ بہتر اور بالاتر تھے۔ وہ بہادر اور ذہین تھے۔ لیکن ان میں بھی چند ذاتی کمزوریاں تھیں۔ وہ لوگوں کو ضرورت سے زیادہ فائدہ پہنچاتے تھے۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کے بجائے پارٹی کی بہتری کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ ان کا اپنا کوئی ذاتی فلسفہ اور اصول نہیں تھا۔ انہیں اس بات پر بھی شرم نہیں آتی تھی کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف حکومت کی تلاش کو ہی اپنا سیاسی فلسفہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ ایک وقت تھا جب وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی آزاد نہ ہو۔ وہ سماج وادی (سوشلسٹ) نظام کے بھی حامی تھے۔ لیکن جب فوجی سمجھوتے ہوئے تو وہ ایسے پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتا کر لای اور اپنے پرانے دعوے بھول گئے ۔ پہلے تو امریکن ان سے ناراض رہتے تھے لیکن بعد میں وہ امریکنوں کے محبوب بن گئے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان باتوں سے زلفی کو بہت کوفت ہوئی تھی۔

زلفی کی رائے کے مطابق اسکندر مرزا بے حد شریف تھے۔ لیکن سیاست کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اسکندر مرزا کا خیال تھا کہ لوگوں پر تھوڑی بہت مہربانی کر کے، چکھ لطیفے اور پر مذاق باتیں سنا کر وہ ملک کی حکومت چلا لیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زلفی نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ایک انتہائی پیچیدہ معاملے کو بے حد آسان شکل دے رہا ہے۔

آئی۔ آئی چندری گر ہمیشہ بمبئی کے معمولی تاجر ہی بنے رہے۔ ان کا سلوک ہمیشہ ایک بینک کے نیچے جیسا ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ سب سے بڑے اسلامی ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ بھٹو کو ان سے صاف طور پر نفرت تھی۔

چوہدری محمد علی ذہین اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ عیار بھی تھے ان کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کو دبا کر رکھنا چاہیے۔ ان کی شخصیت بے حد دل کش تھی اور بات چیت کرنے میں بے حد ہوشیار تھے۔ لیکن بھٹو کا کہنا تھا کہ بھلے ہی بظاہر چوہدری محمد علی بہت ہی سمجھداری کی اور نہایت مناسب بات کرتے ہوں لیکن باطن میں ایسی باطن میں ایسی بات نہیں تھی۔ ان کے سوچنے کا طریقہ بے حد محدود اور تنگ تھا۔ انہیں بھی طرفداری کا بے حد شوق تھا۔ زلفی کے الفاظ میں ''چوہدری محمد علی صوبائی نظریہ سے اوپر نہیں اٹھ سکے حالانکہ وہ ظاہر یہ کرتے تھے کہ ان کا نظریہ قومی ہے۔''

کوئی بھی شخص محمد علی بوگرہ کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ بقول زلفی سیاسی پس منظر کے باوجود محمد علی بوگرہ کو لوگ سمجھتے تھے کہ ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ وہ غلام محمد اور دیگر لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہیں۔ وہ واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر تھے۔ اسی وقت خواجہ ناظم الدین کی سرکار کو

برخاست کر دیا گیا تو انہیں وزیر اعظم کے عہدے پر مقرر کرنے کے لیے امریکہ سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان بلایا گیا۔ وہ چند دن امریکہ میں رہ چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے امریکن طریقے سے حکومت چلانے کی کوشش کی۔ اس سے لوگ انہیں جوکر یا مسخرہ سمجھنے لگے۔ یوں وہ بہت ہی ذہین اور دل کش تھے۔ لیکن بڑے بڑے لوگوں مین جو خوبیاں اور خاصیتیں ہونی چاہئیں وہ ان میں نہ تھیں۔

زلفی کی ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ 1953ء اور 1958ء کے دوران جو تین اہم فیصلے کیے گیے ان کی وجہ سے پاکستان کی تاریخ کچھ اور ہوگئی۔ اگر یہ فیصلے نہ کیے جاتے تو کچھ اور ہوتی۔

الف۔ اکتوبر 1954ء میں گورنر جنرل غلام محمد کے ذریعہ غیر قانونی طریقے سے آئین ساز کونسل کی برخاستگی۔

ب۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی اور نیشنل اسمبلی میں صوبوں کی آبادی کے مطابق نمائندگی کے بجائے ہر صوبے کو یکساں نمائندگی دیے جانے کے متعلق آئینی فارمولہ (یہ فارمولہ محمد علی فارو ملے کے نام سے مشہور ہے اور 14 ستمبر 1953ء کو لاگو کیا گیا تھا۔)

ت۔ مغربی پاکستان کے مختلف تاریخی صوبوں کو ختم کر کے پورے مغربی پاکستان کی غیر قانونی طریقے سے ایک ہی صوبے کے طور پر تعمیر۔ یہ اکتوبر 1955ء میں ہوا تھا۔ آئین ساز اسمبلی کی اس کا کام ختم ہونے سے پہلے برخاستگی۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں یکسانیت کے فارمولے کو زبردستی لاگو کیا جانا اور تاریخی صوبوں کو ختم کرنے سے تنزلی اور بربادی کا ایسا راستہ استوار ہوا جس سے پاکستان کو تقریباً پندرہ سالوں تک فوجی آمریت کے نیچے رہنا پڑا اور پاکستان کی جو تصویر بنائی گئی تھی، وہ بدرنگ اور بدصورت ہوگی۔

ایوب وزارت میں وزیر کی حیثیت سے ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب سرکار کی حکومت کو مقبول بنانے میں بہت امداد دی۔ جیسا کہ ایل۔ ایف۔ رش برک ولیمز نے اپنی کتاب ''دی اسٹیٹ آف پاکستان'' میں لکھا تھ ہے:

''جو بات عوام کو سب سے زیادہ پسند آئی تھی وہ یہ تھی کہ سرکاری ملازمین کے رویئے میں بہت بڑی تبدیلی ہوگئی تھی۔ جیسا کہ پچھلے باب میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ کرپشن اور کام کرنے کی قابلیت نہ ہونے کی برائی کے خلاف مہم شروع کی گئی۔ سرکاری ملازمین کے تمام ریکارڈوں کی جانچ کی گئی ان کے متعلق تحقیقات کی گئی ان سب کے نتیجہ کی شکل میں اول درجے کے 138 غیر فوجی افسروں دوسرے درجہ کے 221 افسروں اور تیسرے درجہ کے 1303 ملازمین کے خلاف کاروائی کی گئی۔ ان افسران اور مالزمین کو یا تو برخاست کر دیا گیا یا انہیں جبراً ملازمت سے چھٹی دے دی گئی یا ان کی تنزلی کر دی گئی۔ اس کاروائی کا اثر جن سرکاری افسران اور ملازمین پر پڑا ان کی تعداد کل تین ہزار تھی۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ محنتی اور قابل افسران اور ملازمین کے حوصلے اور زیادہ بلند ہوگئے۔ انہیں اس قدر حقوق مل گئے کہ پورے محکمہ کو انہوں نے محنتی اور قابلِ بنا دیا۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو بتایا کہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری دفتر وقت مقررہ پر کھلنے لگے۔ افسران اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دینے لگے۔ کلرک عام پبلک کے ساتھ تہذیب سے پیش آنے لگے اور ان کو کوئی مشکل در پیش ہونے پر ان کی امداد کرنے لیگ۔ اب یہ ضروری نہیں تھا کہ متعلقہ افسر سے ملاقات کے لیے پہلے سے وقت لیا جائے اور اس وقت کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دی جائے۔ ہر افسر اپنے دفتر میں موجود رہتا تھا اور اس سے آسانی سے ملاقات کی جا سکتی تھی۔ لال فیتا شاہی بھی گھٹ گئی ۔ سرکاری کام کاج تیزی سے نپٹایا جانے لگا۔ اس سے اعلیٰ افسران کو بہت فائدہ ہوا۔ ان پر ذمہ داریاں بہت ہوتی تھیں۔ لیکن سخت محنت کرنے پر بھی کام نہیں ہو پاتا تھا۔ لیکن انہیں تو سرکار چلانی ہی تھی۔ اس تبدیلی سے ان لوگوں کو بہت راحت ملی۔ ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' ان میں سے

ایک افسر نے مجھ سے کہا۔ ''اب ہم اپنا کام تکلیف دینے والے لیڈران کی دخل اندازی کے بغیر کر سکتے ہیں۔''

''نئے وزیر واقعی بہت قابل تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح صدر تھے۔ وزیر اور صدر دونوں جی توڑ مشقت کرتے تھے''۔

> ''پاکستانی انتظامیہ میں جو گڑی بڑ وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ تیزی سے دور ہونے لگی۔ کرپشن جو ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا اس کی بنیادیں ہی کھود ڈالی گئیں۔ ممکن ہے اصلاح کی خواہش کم اور خوف کا جذبہ زیادہ رہا ہو۔ جو بھی ہو کم از کم لوگوں میں اچھے شہری بننے کا جذبہ اور سماج کے لیے اپنے فرائض بہتر طور پر انجام دینے کا جذبہ پیدا ہونے لگا''۔

جب میں 1959ء اور 1960ء میں پاکستان گیا تو میں نے دیکھا کہ کراچی بہت ہی صاف ستھرا اور قرینے کا شہر بن گیا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ یورپ کا شہر ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ دس سالوں میں کراچی شہریت وسیع ہو گیا ہے۔ شہر کا انتظام بھی اس قدر بہتر ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کراچی کے لیے ایک چھوٹا کراچی بنانے کی منصوبہ بندی کی گئی اور اس شہر کی تعمیر جس تیزی سے کی گئی وہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ فوج نے فوجی چستی اور تیزی کے ساتھ تمام جھونپڑیاں ہٹا دیں۔ شہر میں ایک بھی بھیک مانگنے والا نظر نہ آتا تھا۔

لیکن زلفی کے خیال و خواب بلند تھے۔ اس جیسے دھن کے پکے شخص کے لیے یہ ایک نایاب موقعہ تھا۔ بھٹو کو جس محکمے کا وزیر بنایا جاتا وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کام کرتا۔ انقلابی سرکار میں جب بھٹو کو اکتوبر 1958ء میں پہلی مرتبہ وزیر تجارت بنایا گیا تو اس وقت اس کی عمر صرف 30 سال کی تھی۔ ہند اور پاک میں اس سے کم عمر کا کوئی بھی مرکزی وزیر اب تک مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اپنے دور وزارت میں بھٹو نے ایکسپورٹ بونس اسکیم شروع کی اور دوسرے ممالک کے ساتھ کی جانے والی تجارت کو قانونی دائرہ میں لانے کے لیے بہت بہتر کام کیا۔

جنوری 1960ء میں اقلیت کے معاملات کی وزارت کا کام بھٹو نے سنبھالا۔ اسی وزارت کے ساتھ اطلاعات اور قومی تعمیر نو کے محکمے بھی تھے۔ تین مہینے بعد بھٹو نے ایک اور وزارت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ وزارت ایندھن، بجلی اور قدرتی ذرائع کی تھی۔

1960ء کے بعد بھٹو نے کشمیر کے متعلق معاملوں کے وزیر کے عہدے پر کام کرنا شروع کیا۔ اس سے بھٹو کو مستقبل کے وزیر خارجہ کے طور پر ضروری تجربات حاصل ہو گئے۔ اقوام متحدہ میں تقریر کرنے کے لیے اس عہدے پر کام کرنے سے کافی مصالحہ ہاتھ لگ گیا۔ اقوام متحدہ میں کئی موقوں پر پاکستانی نظریہ کو بھٹو نے نمائندۂ خاص کی حیثیت سے پیش کیا۔ ستمبر 1960ء میں بھٹو نے ہند پاک کے اخباروں کے لیے اصول اور قاعدے بنانے کے لیے ایک ڈیلی گیشن کی رہنمائی کی۔ چند ماہ بعد زلفی ترکی گیا تا کہ انقلاب کے بعد نئی سرکار کے ساتھ مراسم قائم کیے جا سکیں۔ دسمبر 1960ء میں تیل سمجھوتے کی بات چیت کے لیے جانے والے ڈیلی گیشن کی صدارت بھی اس نے کی۔

جو بھی ہو زلفی کا سب سے زیادہ دلچسپ موضوع امور خارجہ تھا۔ جب جنوری 1963ء میں اسے وزیر خارجہ کے عہدے پر مقرر کیا گیا تب اس کی اصل شکل نمایاں ہوئی اور اس کی دلی خواہش پوری ہوئی۔ سبھی ملکوں کے ساتھ بہتر اور کامیاب مراسم بنائے رکھنے کے لیے اسے کافی مشقت کرنی پڑی۔ کیونکہ ہر ملک کے ذاتی مفاد ہوتے ہیں، جدوجہد ہوتی ہے اور مسئلے ہوتے ہیں۔ ہر ملک کے ساتھ تعلقات بنائے رکھنا ٹھیک اس طرح ہے جس طرح بغیر کسی سہارے کے بازی گر کا رسی کے اوپر چلنا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ ہندوستان اور سوویت روس کے درمیان تیل سمجھوتہ کرا دیا۔

جیسا کہ اس نے کھلے عام اعلان کیا تھا کہ ''ہمیشہ سے کہتا رہا ہوں کہ سوویت روس اور کمیونسٹ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات بہتر

ہونے چاہئیں میں نہیں سمجھتا کہ سیٹو اور سینٹو کے فوجی اداروں میں ہماری شمولیت اس نظریئے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ امن عالم کو بنائے رکھنے کے مقصد کے لیے ہم کمیونسٹ ممالک کے ساتھ دوستی رکھ سکتے ہیں اور اس طرح کی دوستی کی کافی گنجائش ہے۔''

17 جولائی 1963ء کو قومی اسمبلی میں بھٹو نے بتایا کہ چین کے ساتھ کئی سال تک ہمارے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ انہیں دنوں محمد علی بوگرہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ سمجھوتا کرنے کے لیے چین نہیں جا سکے تھے۔ ان کی جگہ بھٹو چین گیا اور سرحدوں کے متعلق چین کے ساتھ بہت جلد سمجھوتا ہو گیا۔ یہ سمجھوتا کافی اطمینان بخش تھا۔ اس سمجھوتے کے مطابق بقول بھٹو پاکستان کو 750 مربع میل کا علاقہ ملا۔ اس میں سے کچھ علاقہ قدرتی ذرائع سے مالا مال ہے۔

بھٹو کے نظریئے سے سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ پاکستان محفوظ ہو گیا۔ چین کے ساتھ سمجھوتا ہو جانے پر بقول بھٹو: ''چین اور پاکستان کی درمیانی سرحد پر اب کسی طرح کی جدوجہد کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ ہم نے ان کانٹوں کو دور کر دیا ہے جن کی وجہ سے مستقبل میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی یا کوئی مشکل پیش آ سکتی تھی۔''

جیسا کہ تمام دنیا جانتی ہے کہ آگے چل کر پاکستان اور چین اور زیادہ قریب آ گئے اور اس قدر نزدیکی دوست بن گئے کہ جب صدر نکسن کو چیئرمین ماؤزے تنگ سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے پاکستان کا استعمال ایک ایسے ایماندار دلال کی حیثیت سے کیا جس نے ڈاکٹر ہنری کسنجر کے چین جانے کا انتظام کر دیا۔ یہ بھٹو کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا کہ پاکستان نے نہ صرف دیو جیسے طاقتور پڑوسی سے سمجھوتا کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ افغانستان کے ساتھ برسوں سے چلتے آ رہے خراب تعلقات کو ختم کر کے انہیں بہتر بنانے کی کوشش کی شروعات کی۔

بعد میں بھٹو نے نیشنل اسمبلی کو بتایا کہ پاکستان نے ایران کے ساتھ اپنے تمام مسئلوں کو حل کر لیا ہے۔ برما کے ساتھ اپنے اختلافات دور کر دیئے ہیں۔ نیپال کے ساتھ تعلقات پہلے کی نسبت اور بہتر ہو گئے ہیں۔ انڈونیشیا، فلپائن اور تھائی لینڈ کے ساتھ تعلقات اور مضبوط بنا لیے گئے ہیں۔

بھٹو کی وجہ سے ہی کمیونسٹ چین اور پاکستان کے درمیان ہوائی سروس کو عملی طور پر شروع کیا جا سکا۔ پاکستان ہی ایسے غیر کمیونسٹ ممالک میں سے پہلا ملک تھا جس کو پیکنگ تک ہوائی سروس شروع کرنے کی منظوری دی گئی تھی۔

سری لنکا کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں بھٹو کو کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے نہ صرف سری لنکا میں رہنے والے ان لوگوں کا سوال حل کیا جن کے بزرگ یا والدین پاکستانی تھے بلکہ اس کے بعد صدر پاکستان کے سفر کے بعد سری لنکا کی سرکار کے ساتھ جاری کئے گئے مشترکہ بیان میں یہ بھی شامل کرا دیا کہ ''کشمیر کے سوال کو کشمیری باشندوں کی مرضی کے مطابق ہی حل کیا جانا چاہیے۔''

بھٹو نے اس بات کو اپنی شاندار کامیابی تسلیم کیا۔ اس نے نیشنل اسمبلی میں شیخی بگھارتے ہوئے کہا: ''ہم پاکستان کے رہنے والے اس اعلان کو بے حد اہم تصور کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک نہایت قابل ذکر اعلان ہے کیونکہ اسے ہمارے ایک پڑوسی ملک نے جاری کیا ہے۔ اس کے لیے ہم سری لنکا سرکار کے بے حد ممنون ہیں کیونکہ اس نے صحیح اور مناسب رویہ اپنایا ہے۔۔۔۔ اس جھگڑے کے سلسلے میں ۔۔۔ جو ایک بین الاقوامی جھگڑا ہے۔

زلفی کی ان تمام کارروائیوں کی وجہ سے اسے ملک نے ہی نہیں بلکہ غیر ملکوں نے بھی تسلیم کیا۔ ارجنٹائن ایک ایسا ملک تھا جس نے بھٹو کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو عزت بخشی اور اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے اپنے ملک کا سب سے بڑا غیر فوجی اعزاز بخشا۔ اس تمغے کا نام ہے'' دی گرانڈ کراس آف لیبریڈ جنرل ساں مارٹن۔'' میں جانتا ہوں کہ اس اعزاز کو پا کر زلفی کو بے انتہا خوشی ہوئی ہوگی۔

نواں باب

ہندوستان کے خلاف شکایات

ہندوستان کے بارے میں زلفی کا جو رویہ رہا ہے اس کی بنیادیں تاریخی ہیں اور بہت گہری ہیں۔ انگریزی حکومت کے دوران ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا یہ نظریہ رہا کہ انگریزوں کی طرف داری کرو اور اقلیت کے حقوق کی بنا پر نمائندگی کی مانگ کرو۔ جن مقامات پر مسلمان اکثریت میں تھے وہاں انتظامی دشواریاں پیدا کی جاتی تھیں نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو حکومت میں اور زیادہ حصہ مل جاتا تھا اور انگریزوں سے اور زیادہ حقوق حاصل کرنے کے لیے جھگڑنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔

بہت پہلے یعنی 31-1930ء میں زلفی کے والد سر شاہنواز خان بھٹو نے لندن میں گول میز کانفرنس میں مطالبہ کیا تھا کہ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کر دیا جائے تاکہ صوبہ سندھ مسلم اکثریت کا صوبہ بن جائے۔ اس کے بعد سے سر شاہنواز برابر اس مانگ کی تائید کرتے رہے کہ مسلمان ایک جدا قوم ہے، اس کے لیے ایک علیحدہ ملک ہونا چاہیے۔

بمبئی پریذیڈنسی کے بٹوارے سے بھی پیشتر سر شاہنواز سندھ میں ایسی انتظامی جماعتوں اور نظام کے حمایتی تھے جن پر مسلمان قابض ہوں ۔ یہ انہیں کے اصرار کا نتیجہ تھا کہ بمبئی پریذیڈنسی میں دو پبلک سروس کمیشن بنائے گئے۔ ان میں سے ایک سندھ کے لیے تھا اور دوسرا بمبئی پریذیڈنسی کے باقی حصے کے لیے۔ سر شاہنواز کو سندھ پبلک سروس کمیشن کا صدر بنایا گیا تھا۔

زلفی کے گھر میں جب اس طرح کے معاملات پر بحثیں ہوتیں تو ان سے ایک مخصوص قسم کا ماحول پیدا ہوتا تھا۔ زلفی کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس طرح کے بحث و مباحثہ کا زلفی پر گہرا اثر پڑنا لازمی تھا۔ زلفی پر اس طرح کا جو اثر پڑا اس کے تاثرات زلفی کی تقاریر اور اعلانات میں نمایاں ہوئے ہیں۔ 1940ء میں لاہور قرارداد کے پاس ہونے پر پاکستان کی شکل پہلی مرتبہ باقاعدہ نمایاں ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ شکل اس شکل سے مختلف تھی جو 1974ء میں ہندو پاک تقسیم کے بعد سامنے آئی۔

لاہور قرارداد بہت کچھ ان واقعات پر منحصر تھی جو ہندوستان سرکار کے 1935ء کے ایکٹ کے پاس ہونے اور اس کے مطابق 1937ء میں ہوئے انتخابات کے بعد ظہور میں آئے تھے۔ اس بابت لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ان انتخابات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کو تقریباً سبھی صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی۔

حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس نے سرکار میں مسلم اقلیت کو مناسب مقام نہ دے کر ناانصافی اور بداخلاقی کی۔ اس وجہ سے اقلیت کو جو پہلے سے شک تھا وہ اور بھی بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر جناح کا یہ ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ ایک علیحدہ ملک بنایا جانا چاہیے۔ اس پختہ ارادے کا ہی یہ انجام تھا کہ 1940ء میں لاہور قرارداد پاس ہوئی۔ جس میں پاکستان کا باقاعدہ طور پر مطالبہ کیا گیا تھا۔

متحدہ ہند میں رہنے کے لیے جو مسلمان سرکار کے دیے ہوئے یقین اور گارنٹی سے مطمئن تھے انہوں نے پہلی مرتبہ اس بات پر غور کیا کہ ان کے قدرتی شکوک اسی وقت دور ہونے ممکن ہیں جس وقت پاکستان بن جائے گا۔ دیگر لوگوں کی طرح بھٹو گھرانہ بھی مکمل طور پر مسلم لیگ کا حامی بن گیا اور پاکستان کے مطالبہ کی پرزور حمایت کرنے لگا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے اور کانگریس نے باہمی سمجھوتے کی جو کوششیں کیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اس کی وجہ صرف مسلمانوں کا شک ہی نہیں تھا بلکہ علیحدہ ملک کے مطالبہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی بھوک میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

مہاتما گاندھی اور چکرورتی راج گوپال اچاریہ کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا لیڈر تھا جس نے تقسیم ہند کے مطالبہ کی اہمیت کو بخوبی سمجھا

تھا۔سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ پاکستان کا وجود غیرہ ممکن اور نا قابل عمل ہے۔اس لیے لاہور قرارداد پر کبھی بھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا۔کانگریس کے لیڈروں نے 1937ء کے انتخابات کے بعد اقلیت کے جذبات کے متعلق لاپروائی کا جو رویہ اختیار کیا تھا پاکستان اسی کا نتیجہ تھا۔

زلفی کی زندگی کی تعمیر کا وہی ابتدائی دور تھا جس دور میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان افسوسناک اختلافات میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔کانگیرسی لیڈر پاکستان کے مطالبہ کو جس قدر ٹھکراتے مسلم لیگ اسی قدر پختگی کے ساتھ اپنے مطالبہ کی ضرورت اور حقیقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔

زلفی ایک ایسے ماحول میں پلا بڑھا جس میں مسلمان یہ ثابت کرنے کی جی توڑ کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان ایک خود کفیل اور مضبوط ملک بن سکتا ہے۔پاکستان کی ضرورت ہے اور پاکستان بننا ضروری ہے۔یہ جذبہ زلفی کے دل میں مسلسل قائم رہا۔اس کے ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ ہندوستان ملک کی تقسیم کو کبھی بھی تسلیم نہ کریں گے اور اس تقسیم کو ختم کرنے کی برابر کوششیں کرتے رہیں گے۔

پاکستان میں برسوں تک جو شکوک گھر کیے رہے ہیں اس کا یہ پس منظر ہے۔زلفی کے دل میں ہندوستان کے خلاف پاکستان کے تحفظ اور سلامتی کے ذرائع میں اضافہ کرنے کی جو ضد ہے وہ خوف کے اسی جذبے کا انجام ہے۔1968ء تک زلفی اسی خوف سے خوفزدہ تھا۔اس نے ''متھ آف انڈی پینڈینس'' میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے۔

''اب کیونکہ مسلمان اپنا ایک علیحدہ ملک بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں اس لیے ہندوؤں کے لیے وہ پہلے کی نسبت بڑا چیلنج بن گئے ہیں۔پاکستان کو اس طرح سمجھا جاتا ہے جیسے بھارت ماتا کے جسم کا ایک حصہ بے رحمی سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا ہو اور ہندوؤں کا جنگ جوئی کا جذبہ بری طرح بھڑک اٹھا ہے۔پٹیل نے ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہندوستان چاہے تو پشاور تک دھاوا بول سکتا ہے 1974ء اور 1954ء کے درمیان دونوں مرتبہ ہندوستان نے فوجی کاروائی نہیں کی کیونکہ ایسا کرنے پر بین الاقوامی نفرت، مخالفت اور دیگر نتائج کا اندیشہ تھا۔پھر بھی 1965ء میں ہندوستان نے دھوکے سے حملہ کر دیا۔جنگ جو ہندوستانی یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ پاکستان کو دبوچ لیں گے۔

''ہندوستانی لیڈران پاکستان کی قرارداد کو عملی شکل دینے کے لیے تب ہی راضی ہوئے جب یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ تقسیم لازمی ہے اور انگریزوں سے حکومت حاصل کرنے کے لیے تقسیم کی یہ قیمت ادا کرنی ہی ہوگی۔پاکستان بنائے جانے پر رضامند ہوتے ہوئے بھی دراصل گاندھی، نہرو، پٹیل اور دیگر لیڈروں نے دو ملکوں کے اصول کو تسلیم نہیں کیا۔انہوں نے تقسیم کو وقت کا تقاضہ سمجھ کر یہ کڑوا گھونٹ پی لیا۔انہیں امید تھی کہ نیا ملک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پائے گا اور کود سے بڑے اور طاقتور پڑوسیوں کے دباؤ کی وجہ سے بھربھرا کر گر پڑے گا۔''

زلفی کا یہ خیال و قیاس ہی اس کے سیاسی نظریہ کی سب سے مخصوص بنیاد ہے۔

محمد علی جناح کی رہنمائی میں مسلم لیگ نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔محمد علی جناح منجھے ہوئے سیاست داں اور بہت ہی ذہین اور ہوشیار وکیل تھے۔ان کی سوجھ بوجھ سے مسلم لیگ نے کانگریس کے لیڈروں کی ہر غلطی اور خامی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بڑی آسانی سے کانگیرسی لیڈروں کی خودسری اور ڈھل مل اعلانوں کی بنا پر اپنے کیس کو مضبوط بناتے گئے۔

جناح کو ہیرو ماننا زلفی کے لیے قدرتی تھا۔وہ جناح کا اس قدر زبردست حامی بن گیا کہ اس نے ٹھیک انہیں کے طور طریقے پر اپنی زندگی ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگر کوئی زلفی کے اس رویے اور طور طریقوں کا مطالعہ کرے جو اس نے بنگلہ دیش کے بننے اور اس سے پہلے پیدا ہوئی کشمکش اور مصیبت

کے دوران اختیار کیا تھا تو وہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہندوستان کی تقسیم ہونے سے پیشتر فیصلہ کن سالوں میں محمد علی جناح نے اختیار کیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وجوہات اور نتائج یکساں نہیں تھے۔ لیکن رویے کی یکسانیت صاف ظاہر ہے۔

میں زلفی کو خامیوں اور شکایتوں کے تنگ و محدود دائرے سے باہر نکال لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اسے نرمی بھرے اس وسیع نظریہ کی فلاسفی کا درس نہ دے سکا جس سے وہ معمولی اور نچلی سطح سے اوپر اٹھ پاتا اور کسی حد تک تاریخ کے لازمی دباؤ کو ختم کر پاتا۔ میں اسے اپنی زندگی کی بہت بڑی ناکامی تصور کرتا ہوں۔ ایک طرف مسلمانوں کا پاکستان کا مطالبہ کسی حد تک پورا ہو گیا تھا لیکن پاکستان کے دو ٹکڑوں میں بٹنے سے زلفی دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا، جل رہا تھا اور ایک طرف ہندوستان ہر مذہب کو یکساں مان کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے آئین بنایا۔ جس کی بنیاد خلوص اور نرمی سے پر نظریہ تھی۔ وہ آئین اگر چل نہیں پایا تو اس میں قصور اس کے بنانے والوں کا نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنے والوں کا ہے جو حرص و ہوس سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکے۔

مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کی خواہش کس طرح اکثریت کے خلاف نفرت اور ہندوستان کے خلاف جدوجہد میں تبدیل ہو گئی اس کا مطالعہ واقعی دلچسپ ہے۔ لاہور قرارداد پاس کرتے وقت جو امیدیں تھیں اور آخر میں پاکستان کو جو کچھ حاصل ہوا دونوں چیزیں مختلف تھیں۔ تقسیم کا مطالبہ کرنے والے یہ نہیں سوچ پائے کہ پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم کر دیا جائے گا اور ہندوستانی ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں کو اپنی ریاستوں کے عوام کی خواہش کو کچل کر ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کے لیے مخصوص حق حاصل ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو صلاح دی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی رعایا کی خواہش کے مطابق فیصلہ کریں۔ جونا گڑھ، کشمیر اور حیدر آباد جو کچھ ہوا وہ حکومت سوچنے کے دستاویز کے بنیادی اختلاف کا نتیجہ تھا۔ پاکستان کی بنیاد قائم ہونے سے پیشتر وہاں کے عوام میں پہلے تو شکایت کا جذبہ پیدا ہوا۔ پھر یہ جذبہ شک میں تبدیل ہو گیا۔ زلفی نے اپنی کتاب ''دی متھ آف انڈی پینڈینس'' میں لکھا ہے۔

''حکومت برطانیہ نے پاکستان کے مفاد کے خلاف حالات کو غیر متوازی بنانے کے لیے ہر موقعے کا استعمال کیا۔ پنجاب کے ٹکڑے کر دیئے۔ یہ بات تقسیم کے اس اصول کے خلاف تھی کہ مشترکہ آبادی والے علاقے آسام کے ٹکڑے نہیں کیے جائیں گے۔ اس اصول کی خلاف ورزی کی وجہ سے امرتسر کے باہر کے علاقے جہاں مسلم آبادی اکثریت میں تھی اور جن میں گرداس پورا اور فیروز پور شامل تھے، ہندوستان کے حوالے کر دیئے گئے۔ آسام چھوڑ دیا گیا اور بنگال کو تقسیم کر دیا گیا۔ ہندوستان کو ایسے گلیارے دے دیے گئے جن سے وہ شمال مُس جموں کشمیر تک اور مشرق میں آسام اور تری پورا تک جا سکے۔ بنگال کے شمال میں آسام تک جانے کے لیے جو راستہ ملا اس سے ہندوستان بغیر کسی رکاوٹ کے نیپال کی جنوبی سرحد تک پہنچ سکتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کو ہمالیہ پہاڑی کی سکم اور بھوٹان ریاستوں تک پہنچنے کا موقعہ مل گیا۔ یہ دونوں چھوٹی چھوٹی ریاستیں چین کی سرحد پر واقع ہیں۔ علاقائی تقسیم اور دیگر دعووں کے سلسلے میں پاکستان کو شک کا فائدہ کبھی نہیں حاصل ہوا۔

''اس وقت ہندوستان کے جو حالات تھے ان کو دیکھتے ہوئے سرکار برطانیہ ہند کے حق میں اور زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سرکار برطانیہ، آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک قرارداد کے مطابق پر امن طریقے سے ہندوستان کی حکومت کانگریس اور مسلم لیگ کے حوالے کرنے کا سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ لیکن حکومت جس طرح حوالے کی گئی اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا پاکستان کے متعلق نظریہ دوستانہ اور پر خلوص نہیں تھا۔ انتظامی، حفاظتی اور مالی معاملوں میں پاکستان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو بھی پورا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ قانون اور امن قائم رکھنے کے لیے روپیہ، جائیداد، فوجی ساز و سامان کے سٹور، اسٹرلنگ بیلنس اور یہاں تک کہ سرکاری خزانے کی تقسیم اور حوالے کرنے کے معاملے میں ہندوستان کو ایسے حقوق دے دیے گئے جو پاکستان کا دم گھونٹنے والے تھے۔ مسلمانوں نے خود ارادیت کا حق حاصل

کرلیا تھا اس لیے ان کو ایک کمزور اور بے جان ریاست دے کر سزادی جارہی تھی جس سے کہ وہ غیر مارکس وادی معانی میں خود بخود ختم ہوجائیں۔

ان واقعات کے نتیجے میں اور ریڈکلف بنچ فیصلے کو جلدی کیے جانے کی وجہ سے خوفناک خون خرابہ ہو۔ پنجاب اور بنگال کے متعلق جو طریقہ اختیار کای گیا وہ آسام کے متعلق اختیار نہین کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف سے لاکھوں لوگوں کو ایک سے دوسرے ملک میں جانا پڑا۔ قتل، لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم ہوا تھا اور لوگوں کو نا قابل ذکر مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ اپنی کتاب ''دی کوئسٹ فار پیس'' میں زلفی نے یہ الزام دہرایا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں 550 فرقہ وارانہ افساد ہوئے۔ ان کے علاوہ 50 لاکھ مسلمانوں کو تقسیم کے بعد ملک چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس کے ساتھ زلفی یہ لکھنا بھول گئے کہ لاکھوں لوگ متحدہ ہندوستان کے اس حصے سے اجڑ کر ہندوستان میں آئے جو حصہ پاکستان میں رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ زلفی نے ان فرقہ وارانہ فسادات کا بھی ذکر نہیں کیا۔ جو تقسیم کے بعد پاکستان میں ہوئے تھے۔ خیر جو بھی ہو ان افسوس ناک بنیادوں پر ہندو پاک کے آئندہ تعلقات کی بنیاد رکھی گئی۔

دسواں باب

ہم پھر ملے

میں عدن میں بینک آف انڈیا کی بلڈنگ کے کام میں مصروف تھا۔ جس کے لیے مجھے کبھی کبھی وہاں جانا پڑتا تھا۔ میرا ہوائی جہاز جیسے ہی کراچی اترتا اور جتنی بھی دیر کے لیے وہاں ٹھہراتا میں زلفی سے ملنے کے لیے بھاگ جاتا۔ کبھی کبھی میں اپنا سفر درمیان میں ہی ملتوی کر کے چند دنوں کے لیے کراچی ٹھہر جاتا۔

فروری 1959ء میں صبح تین بجے میرا ہوائی جہاز عدن جاتے ہوئے کراچی ہوائی اڈے پر اتر۔ آٹھ سال بعد زلفی سے میری ملاقات ہو رہی تھی۔ زلفی ان دنوں وزیر تجارت تھا اور اپنی بیوی نصرت کی ہمراہی میں میری خیر مقدم کے لیے ہوائی اڈے پر کھڑا تھا۔ ہم لوگوں نے کراچی ہوائی اڈے کے وی۔ آئی۔ پی روم میں ایک گھنٹہ تک بات چیت کی۔ ہماری گفتگو کا موضوع گذری ہوئی باتیں تھیں نصرت سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں اس سے اپنا تعارف کرانے کے لیے بیحد بیقرار تھا۔

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ جدوجہد کی پالیسی اور اس کے ہندو پاک تعلقات پر پڑنے والے اثرات کی وجہ سے میں زلفی کے گھر والوں کے یادہ قریب نہیں آسکا۔ ہم لوگ کبھی چند دنوں کے لیے ہی مل پاتے کیونکہ یہ ملاقاتیں پاکستان سے گذرنے کے دوران ہی ہوتی تھیں وقت اور حالات نے کچھ ایسی سازش شروع سے ہی کی تھی کہ ہم دونوں کے گھرانے ایک دوسرے سے دور ہی رہتے آئے تھے۔ اس معاملے میں میری نسبت زلفی زیادہ خوب نصیب ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ دینا کو کیلیفورنیا سے ہی جانتا تھا اور اسے اکثر وینا سے ملاقات کرنے کے موقع ملتے رہے تھے۔ لیکن میری پہلی مرتبہ اس روز صبح تین بجے نصرت کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اپنے گہرے اور بے حد نزدیکی دوست کی بیوی کے ساتھ بے وقت اور وی۔ آئی۔ پی روم میں ملاقات کرنا میرے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔

ایک سال کے بعد پھر عدن جا رہا تھا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ میری بیوی وینا بھی تھی ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ عدن جاتے ہوئے راستے میں ٹھہر کر ہم چند دن بھٹو کے گھر والوں کے ساتھ گذاریں گے۔ اس موقعے پر مجھے گذری ہوئی یادیں دوبارہ تازہ کرنے کا نایاب موقعہ ملا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھ سکا کہ مارسشل لا (فوجی قانون) کے تحت پاکستان میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ہم لوگوں نے کئی سیر گاہوں کی سیر کی، کچھ پرانے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں بمبئی کی رہنے والی میری رشتے کی بہن بانو بی ملجی بھی شامل تھی۔ اس نے کراچی کے ڈاکٹر جیمی مہتہ سے شادی کی تھی۔ ڈاکٹر مہتہ کچھ مدت تک بھٹو فیملی کے ڈاکٹر رہ چکے تھے۔

ہم لوگ بھٹو کے گھر ہی ٹھہرے۔ لیکن ان دنوں زلفی پاکستان کے قومی تعمیرات کے کاموں میں مصروف تھا۔ اس لیے ہم لوگوں کی خاطر تواضع کی ذمہ داری نصرت پر تھی۔

نصرت کے بزرگ ایران کے رہنے والے تھے۔ نصرت کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی اور شادی پاکستان میں وہ نہایت پرخلوص، دل کش اور نرم دل کی خاتون ہے۔ وہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی بہت خیال رکھتی۔ وہ میرے بمبئی کے دیگر گہرے دوستوں کی طرح سلوک کر کے میرے اس قدر قریب آ گئی کہ جلد ہی مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ گویا میں اپنے ہی گھر میں آ گیا ہوں۔ اس مرتبہ مجھے ان کے بچوں کو دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ کچھ بچے سکول گئے ہوئے تھے اور کچھ بہت چھوٹے تھے۔

نصرت کے متعلق جو بات مجھے سب سے زیادہ اچھی لگی وہ تھی اس کی قدرتی حیاداری، شرافت اور خلاق۔ وہ بہت کم گو تھی۔ جو بھی کام کرتی تھی بہت ہی صفائی اور سلیقے سے کرتی تھی۔ سڑکوں پر چلتے وقت یا دکانوں میں خریداری وقت کسی کو یہ جان پانے کا موقعہ نہیں دیتی تھی کہ وہ

کسی وزیر کی بیوی ہے یا اس کے ساتھ کوئی مخصوص سلوک کیا جانا چاہیے۔

ایک خاص موقعہ مجھے یاد ہے۔ اس موقعے پر اس نے کئی گھنٹے کراچی ہوائی اڈے پر انتظامیہ میں گذارے۔ غلطی سے میں ایک مصیبت کھڑی کر بیٹھا تھا۔ میں نے آتے وقت ٹریولرز چیکوں کی رقم روپوں میں بتائی تھی۔ لیکن روانگی کے وقت وہ رقم پونڈ اسٹرلنگ میں بتادی۔ کسٹم آفیسر طنز اور دھمکی بھرے انداز میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستانی روپے یکا یک پونڈ اسٹرلنگ میں کس طرح تبدیل ہوگئے۔ لیکن اس پورے واقعے کے دوران نصرت نے اپنا تعارف دیے بغیر کسٹم آفیسر کو نہایت صبر واطمینان کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ غلطی کیسے اور کیوں ہوئی۔

آخر میں زلفی کی بیوی کے ذریعے زلفی کا اثر ورسوخ کام نہیں آیا لیکن میرے ذاتی اثر ورسوخ سے کام بن گیا اور کسی طرح کسٹم آفیسر کے چنگل سے رہائی نصیب ہوئی۔ بعد میں مجھے یہ جان کر اور بھی تعجب ہوا کہ وہ افسر میرا دور کا رشتہ دار تھا۔ پارسی ملکوں کی حدود میں قید نہیں ہیں۔ صدیوں سے وہ مختلف ممالک میں رہتے آئے ہیں۔ اس لیے دنیا کے دور دراز گوشوں تک ان کے رشتہ داروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ مصیبت کے وقت اگر وہ مل جاتے ہیں تو بھگوان اور قوم کے نام پر ایک دوسرے کی امداد کر کے اسے مصیبت سے نجات دلا دیتے ہیں۔

واپسی پر میں نے کراچی میں کچھ اور وقت گارنے کی سکیم بنائی لیکن واپس میں ہمارے ہوائی جہاز کے دو انجن بیکار ہوگئے اور اسے بحر عرب کے کنارے سے دور میسارک نام کے ایک جزیرے مین اترنا پڑا۔ یہاں ہمیں 36 گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک رکنا پڑا۔

یہ جزیرہ پرانی رائل ائیر فورس کا اڈا تھا اور یہاں بہت کم سہولتیں دستیاب تھیں۔ رائل ائیر فورس کے کچھ افسر اور کارکن یہاں تعینات تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ایک ہم سفر کے ساتھ ایک ڈسپنسری میں رات گذاری تھی۔ میرے اس ہم سفر کی ریڑھ کی ہڈی میں کچھ تکلیف تھی۔ وہ پوری رات درد سے چلاتا رہا تھا اور اس کے چلانے کی وجہ سے ہم سب لوگ جاگتے رہے تھے۔ اس سے ہمارے اس تجربہ کے ڈرامائی انداز میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا۔ باقی لوگ اس ہوائی اڈے کی بلڈنگ کے فرش پر سوئے تھے۔ میری بیوی دینا کے سونے کا انتظام کسی ڈارمیٹری میں دوسری عورتوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔

ائیر فورس کے افسران نے ہمیں آرام دینے کی جی جان سے کوشش کی۔ انہوں نے اپنا راشن ہمیں دیدیا اور جس قدر بہتر کھانا ممکن تھا ہمیں کھلایا۔ لیکن جلد ہی پانی ختم ہوگیا۔ بیئر ختم ہوگئی۔ کھانے کا سامان ختم ہوگیا۔ مختصراً جو بھی چیزیں وہاں تھیں سب ختم ہوگئیں۔ حالانکہ ہم لوگ کراچی سے صرف ساڑھے چار سو میل دور تھے۔ لیکن دوسرے ہوائی جہاز کو نیروبی سے آنا تھا۔ اس کے آنے میں 36 گھنٹے لگ گئے۔ ہوائی جہاز کی آمد کے بعد ہم لوگوں نے راحت کی سانس لی۔

ہم سب بڑے آرام سے ہوائی جہاز میں سوار ہوگئے۔ ہوائی جہاز آہستہ آہستہ چل کر رن وے پر پہنچ گیا۔ وہ پرواز کرنے ہی والا تھا کہ کپتان نے اعلان کیا کہ جہاز میں کچھ مشینی خرابی آگئی ہے۔ اس لیے ہمیں پھر واپس ہوائی اڈے پر آنا پڑے گا۔

آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اس اعلان کو سن کر لوگ کس طرح کراہ اٹھے تھے۔ لیکن کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ کوئی دوسرا چارہ بھی نہ تھا۔ ہمیں اس وقت تک ہوائی جہاز سے باہر رہنا تھا۔ جس وقت تک مشینی خرابی دور کر لی جاتی۔ آخر ہوائی جہاز نے پرواز کی اور ہم لوگ کراچی پہنچ گئے اس وقت صبح کے تین یا چار بجے تھے۔

شہنشاہ اور ملکہ ایران ان دنوں پاکستان کے دورے پر تھے اور اس روز ایرانی سفارت خانہ میں شاہی ڈنر تھا جس کی دعوت مجھے بھی دی گئی تھی۔ یہ دعوت نامہ زلفی کی محبت کا نتیجہ تھا۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے کہ اس سے پہلے کی رات ہم نے بحر عرب کے کنارے سے دور ایک

چھوٹے سے جزیرہ مُس کس طرح گذاری تھی اور دوسری رات ایرانی سفارت خانہ میں ایک شاہی ڈنر میں شامل ہوکر گذاری۔ جس میں شہنشاہ اور ملکۂ ایران، صدر ایوب خان اور ان کی وزارت کے دیگر ممبران اور پاکستان کے اونچے طبقے کے لوگ موجود تھے۔ اسی طرح کے ایک دوسرے سے مخالف واقعات سے انسان زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے۔

اس روز شام کو میں نے پاکستان کی تاریخ میں ایک چھوٹا سا فٹ نوٹ لکھا۔ میں صدر ایوب کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ پاکستان کے نئے دارالخلافہ کی تعمیر کی جارہی ہے لیکن اس طرح کے شہر کو رہائش کے لائق بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے ایسا نام دیا جائے جو لوگوں کو متاثر کر سکے اور لوگوں کے تخیل کی پرواز تیز ہو سکے۔ صرف پاکستان کا دارالخلافہ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔

مجھے یہ بات بخوبی یاد ہے کہ وہ اتوار کی رات تھی۔ سوموار کو میں بمبئی آ گیا اور بدھ وار کو صبح میں نے بمبئی کے اخبارات میں پڑھا کہ پاکستان سرکار نے اپنے نئے دارالخلافہ کا نام اسلام آباد رکھا ہے۔ اس وقت میں نے اسے محض اتفاق سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ صدر ایوب نے میری بات پر غور کیا۔ سوموار کو ایوب صاحب اپنے وزیروں کے ہمراہ راولپنڈی پہنچے۔ سوموار کو تیسرے پہر ایک سرکلر بھیجا گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ منگل وار کو کیبنٹ کی بیٹھک ہوگی۔ اس سرکلر میں کوئی ایجنڈا نہیں تھا۔ جب منگل وار کو کیبنٹ کی بیٹھک ہوئی تو صدر ایوب نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ ان کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تجویز دیا ہے کہ دارالخلافہ کا نام فوراً تجویز کیا جائے۔

کئی نام پیش کیے گئے۔ ان میں ایک نام ایوب آباد بھی تھا۔ تب ہی کسی نے کہا کہ دارالخلافہ کا نام اسلام آباد ہونا چاہیے۔ ایوب خان نے کہا ''بالکل ٹھیک۔'' اور اس طرح پاکستان کے دارالخلافہ کا نام رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد ایوب نے ہفتوں یہ کہانی لوگوں کو سنائی۔ یہ بات مجھے بھی بتائی گئی اور اسے کئی لوگوں نے پارٹیوں پر دعوتوں کے موقعوں پر سنایا۔

اس مرتبہ بمبئی واپس آنے پر میں بہت خوش تھا۔ گذشتہ تین دنوں کے تجربات نے مجھے تھکا دیا تھا۔ اس تھکان کا مجھ پر اثر پڑ رہا تھا۔ دوسرے مجھے اس بات کی بھی بے حد خوشی تھی کہ ہم لوگ صحیح سلامت پہنچ گئے تھے۔

میں پہلے ہی تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ ہمارا ہوائی جہاز کس طرح بحر عرب کے کنارے سے دور میسارک نام کے ایک چھوٹے سے جزیرہ میں مشینی خرابی کی وجہ سے مجبور ہوکر اترا تھا اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ یہ جزیرہ کراچی سے ساڑھے چار سو میل دور تھا۔ اس جزیرے کی ڈسپنسری میں میں نے رات گذاری تھی اور اپنے ایک ہم سفر کی ریڑھ کی ہڈی میں درد ہونے کی وجہ سے میں ساری رات سو نہیں پایا تھا۔ اس کی نسبت وہ رات کس قدر مختلف تھی جس میں میں نے ایرانی سفارت خانے کے شاہی ڈنر میں حصہ لیا تھا جس کا اہتمام ایران کے شہنشاہ اور ملکہ نے کیا تھا۔ ہماری جو ذہنی حالت تھی اسے درست کرنے میں نصرت نے بڑی امداد دی تھی اور اپنے پرخلوص سلوک اور برتاؤ سے ایک روز پہلے کی رات کے تلخ تجربہ کی یاد سے نجات دلا دی تھی۔

1956ء سے 1964ء تک میں او بیرائے کے لیے ماہر تعمیر کا کام کرتا رہا۔ نئی دلی میں او بیرائے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی بلڈنگ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کے ڈیزائن اور تعمیر کا کام میرے ذمے تھا۔ اپریل 1961ء میں بکی اور گڈی او بیرائے جو میرے بہت ہی قریبی دوست ہیں کہنے لگے کہ انہوں نے فلیش مینس ہوٹل میں ایک نیا ونگ شامل کیا ہے اور ہوٹل میں چند تبدیلیاں بھ کی ہی اس لیے مجھے راولپنڈی جانا چاہیے۔ پاکستان میں او بیرائے کا جو ماہر تعمیر تھا اس کا نام بل پیری تھا۔ وہ بھی ہمارا اچھا دوست تھا۔ جب ہم ہندوستان واپس آئے تو میں کچھ دکھی تھا۔ کیونکہ جب میں پاکستان میں تھا۔ تو مجھے ماہر تعمیر کے کئی کام دیے جانے کی پیشکش کی گئی۔ میں جانتا تھا کہ بمبئی میں رہنے کی وجہ سے میں ان

کاموں کو کرنہی پاؤ نگا حالانکہ بل پیری اور مُس نے یہ طے کیا تھا کہ ہم دونوں مل کر یہ کام کریں گے۔لیکن میں جانتا تھا کہ یہ شراکت چل نہیں پائے گی۔

پاکستان میں اوبیرائے کے بھیجنے پر مجھے زلفی اور اس کے گھر کے لوگوں سے ملاقات کرنے کا ایک موقعہ اور مل گیا۔ہم لوگ پاکستان کے نئے دارالخلافہ کو دیکھنے کے لیے بھی بیقرار تھے۔اس وقت دارالخلافہ زیرتعمیر تھا۔

راولپنڈی میں چند دن گذارنے کے بعد ہم لوگ زلفی کے ساتھ پشاور گئے وہاں بھی اوبیرائے کا ایک ہوٹل تھا۔وہاں سے ہم لوگ سوات گئے۔سوات آنے کی دعوت ہمیں وہاں کے امیر نے دی تھی۔امیر اورنگ زیب کا پوتا تھا۔اور اورنگزیب ڈہرہ دون سکول کا میرا پرانا دوست تھا۔اس کی شادی ایوب کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔

سوات کی گھاٹی اس قدر خوبصورت ہے کہ محض سن کر اس کی خوبصورتی پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔مجھے خوشی تھی کہ ہم لوگوں کو اورنگ زیب سے گھریلو ماحول میں ملنے کا موقعہ ملا۔امیر نے ہم لوگوں کے اعزاز میں جس دعوت کا اہتمام کیا تھا وہ بھی ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔اس دعوت میں کھانے پروسنے کا انتظام اس قدر خوبصورت تھا کہ اسے آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پیشتر میں نے اس قدر شاندار کسی اور دعوت میں حصہ لیا ہو۔دعوت میں کھانا اس قدر سلیقے،خاموشی اور ہوشیاری سے پروسا گیا تھا کہ ذرا سی بھی کہین گڑبڑ نہتھی۔

زلفی ہم لوگوں کو درہ خیبر لے گیا۔اس درہ کے مطابق ہم نے پہلے کافی پڑھا اور سنا تھا۔وہاں ہم نے دوپہر کا کھانا پاکستانی فوجیوں کے گیریژن کے ساتھ کھایا۔ہم وہاں کے افسران کی چستی اور پھرتی سے بے حد متاثر ہوئے۔اس کے بعد ہم لوگ لاہور جانے سے پیشتر پشاور لوٹ آئے۔وہاں ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے دوست ملے۔میں لاہور پہلی مرتبہ گیا تھا۔میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ لاہور نے لوگوں کا دل کس طرح موہ لیا ہے۔لاہور جانے کے بعد ہی یہ بات میری سمجھ میں آسکی۔

اس دوران ہم مسلسل کار سے ہی سفر کرتے رہے۔نصرت ہمارے ساتھ تھی۔وہ ہمیں انگلیوں کے اشارے سے نئے نئے مقامات دکھاتی جاتی تھی۔اوران کے متعلق اسے جو کچھ معلوم تھا۔ہمیں بتاتی جارہی تھی۔اس سفر میں مجھے نصرت کو اور اچھی طرح جاننے کا موقعہ ملا۔مجھے صرف اس بات کا افسوس تھا کہ وِینا میرے ساتھ نہ تھی۔

نصرت کے متعلق ایک اور بہت اچھی بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پرسکون اور سنجیدہ رہتی ہے۔اور شاندار لباس پہنتی ہے۔بہت ہی دلکش نظر آتی ہے۔دراصل سالوں کے بعد جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ مظاہروں میں آگے بڑھ کر حصہ لے رہی تھی اور جلسوں میں تقریریں کررہی تھی جبکہ زلفی میاں والی جیل میں قید تھا۔مجھے یاد ہے کہ میں نے نصرت کے کئی فوٹو دیکھے تھے۔مجھ پر اس بات کا بہت ہی مناسب اثر پڑا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سنبھالے ہوئے ہے اور بڑی خوبی سے کام کررہی ہے۔کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ زلفی کی مصروفیت کے باوجود نصرت نے بہت ہی پیارے پیارے بچوں کو جنم دیا۔جن میں سے تین کو مجھے اچھی طرح جاننا پہچاننا ہے۔حالانکہ میں نے انہیں ان کے بچپن سے ہی اچھی طرح دیکھا ہے۔

میں زلفی کو اس بات کے لیے کبھی معاف نہیں کرسکتا کہ وہ نصرت کو شملہ نہیں لایا۔لیکن بےنظیر کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے بےنظیر کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا ایک بہترین موقعہ ملا۔میں نے دیکھا کہ زلفی کو اپنی بیٹی پر بہت ناز ہے اور ہونا بھی چاہیے۔کیونکہ بےنظیر میں اپنی ماں کی دل کشی ہے اور اپنے والد کی خوداعتمادی۔بہت ہی ذہین طالبہ ہے۔ہارورڈ یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کا مطالعہ کررہی ہے۔شملہ کے سفر کے دوران اس نے لوگوں کے ساتھ جس طرح سلوک کیا،ان سے ملاقاتیں کیں اور خاص طور پر اخباری نامہ نگاروں

سے۔۔۔جواس سے اپنے مطلب کی بات اگلوانا چاہتے تھے۔۔۔ملاقات کرنے اور بات چیت کرنے میں بے نظیر نے یہ ثابت کر دیا کہ بھلے ہی اس کی عمر ابھی صرف 19 برس کی ہے لیکن دماغی طور سے وہ عمر رسیدہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے والد کی پرستار ہے۔اسے سب کچھ سمجھتی ہے۔جب اس نے مجھے زلفی سے بات چیت کرتے سنا تو اسے تعجب ہوا کہ میں زلفی کے ساتھ اس قدر بے تکلفی سے بات چیت کر سکتا ہوں۔کیونکہ اس نے کبھی کسی کو زلفی کے ساتھ اس قدر بے تکلفی کا برتاؤ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔میرے برتاؤ کی وجہ سے اسے جو چوٹ پہنچی اس سے وہ تھوڑی سی دیر کے لیے حیرت زدہ ہوگئی تھی لیکن پھر نارمل ہوگئی اور ہمارے تعلقات کو سمجھ گئی۔اس نے اس بات کا پورا مزا لینا شروع کر دیا کہ میں اس کے والد کو جہاں تہاں موقعہ ملنے پر چٹکی کاٹ سکتا ہوں۔

جو بھی ہو اسے اس بات سے سخت افسوس ہوا کہ اس کے والد کے متعلق بے سر پیر کی افواہیں پھیلائی گئی ہیں۔نہ صرف اس کے والد کے متعلق بلکہ پورے کنبہ کے متعلق جب تب اخبارات میں اس طرح کی خبریں شائع ہوتی رہیں۔ہندوستانی مصنفین کی کئی کتابوں میں بھی ایسے چربے دیکھنے میں آتے ہیں۔مجھے ایک رسالہ کی بات بخوبی یاد ہے جس میں صدر بھٹو کا ایک اسکیچ شائع ہوا تھا جسے نہایت اوٹ پٹانگ طریقے سے بنایا گیا تھا۔اس کے اوپر ''ضرورت ہے'' بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا۔وہ ان پوسٹوں کی یاد دہانی کراتا تھا جو امریکہ کی مغربی ریاستوں میں دکھائی پڑتے ہیں۔وہ خاکہ بچوں کے لیے شائع کی گئی کارٹون کی ایک کتاب میں تھا۔جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے بھی ناگوار گذرا۔اس لیے اگر بے نظیر نے بھی ناگواری ظاہر کی تو اس کے تاثر کے لیے اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ بے نظیر کا مستقبل شاندار ہے مجھے پوری امید ہے اور میری دعا ہے کہ وہ اپنے والد کی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئی۔مجھے اس وقت کا انتظار ہے جب میں زلفی کے دیگر تین بچوں سے ملوں گا خاص طور پر اس کے بڑے بیٹے سے۔اس کا فوٹو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دلیر ہے۔

مارچ 1963ء میں میں چورنگی اور مڈلٹن سٹریٹ پر بننے والی جیون بیمانگم کی عمارت کا کام کر رہا تھا۔ان دنوں مجھے اکثر کلکتہ جانا پڑتا تھا۔اس لیے جب ذوالفقار علی بھٹو اور سردار سورن سنگھ ہند پاک اختلافات کے متعلق بات چیت کرنے میں مصروف تھے تو میں نے سوچا کہ میں کلکتہ کے راج بھون میں ٹھہرا ہوا تھا۔میں گرانڈ ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔جب کبھی بھٹو سورن سنگھ کے ساتھ نہ ہوتا تو ہم لوگ راج بھون کے ایک کمرے میں بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ہماری گفتگو کا موضوع عام طور پر گذشتہ یادیں ہوتی تھیں یا ہم موجودہ سیاست کے متعلق اپنی اپنی رائے ظاہر کیا کرتے تھے۔

ایک موقعے پر۔۔۔۔۔میرا خیال ہے شاید اس وقت تک سردار سورن سنگھ کے ساتھ دہلی میں بات چیت ہو چکی تھی۔۔۔زلفی نے طے کیا کہ وہ بمبئی آئے گا اور وہاں کچھ دن رہے گا۔وہ اپنی چچازاد بہن کی قبر پر جانا چاہتا تھا جو پونا میں تھی۔وہ ''اسپاڈروسیبری'' میں میرے ساتھ ٹھہرا جہاں اس نے بچپن میں بے شمار راتیں گذاری تھیں۔ہمیں اس کا اپنے ساتھ ٹھہرنا بہت اچھا لگا۔زلفی نے بمبئی کے اپنے پرانے دوستوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔

صدر پاکستان بننے سے پیشتر بھٹو کے ساتھ میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ ایوب کے ہمراہ کولمبو گیا تھا۔ایوب بحری بیڑے کے ایک جہاز سے اور زلفی ہوائی جہاز سے واپس پاکستان جا رہے تھے۔زلفی نے بمبئی میں رکنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ وہ ڈیڑھ گھنٹہ میرے ساتھ ہوائی اڈے پر گذار سکے۔میں بڑی مشکل سے کسٹم آفیسروں کو اس کے لیے راضی کر پایا کہ وہ مجھے بھٹو سے ملاقات کر لینے دیں اور

ان کے ساتھ سانتا کروز ہوائی اڈے کے وی، آئی، پی روم میں ہم لوگوں کو کچھ دیر بات چیت کرنے دیں۔

اس موقعے پر میں نے زلفی سے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کافی بگڑ گئے ہیں۔ خاص طور سے اس وقت سے جب سے وہ وزیر خارجہ ہوا ہے۔ میں نے ان تعلقات کے بگڑنے کا 90 فیصد قصور اس کے سر تھوپ دیا۔ اس نے کہا کہ بات ایسی نہیں ہے۔ اب حالات بدل گئے ہیں اور لوگوں میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ بیکار کی بات ہے۔ جو حالات ہیں ان میں اگر میں بھی ہندوستان کا وزیر خارجہ ہوتا تو شائد ہند اور پاک کے اختلافات دور نہ کر پاتا۔ اس نے کہا کہ بات ایسی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آدھے گھنٹے میں سمجھوتا ہو سکتا ہے۔

اس سفر میں اورنگزیب اور اس کی بیوی زلفی کے ہمراہ تھے۔ ہندوستانی فلم ایکٹر سنجے بھی اپنی بیوی کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ وہ اورنگزیب کے پرانے دوست ہیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے ہوائی اڈے پر آئے تھے۔

یہ بات ستمبر 1963ء کی ہے۔ اس کے بعد زلفی سے جون 1972ء تک میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ زلفی سے میری ملاقات شملہ کی چوٹی کانفرنس میں ہوئی۔

اس وقت تک بے شمار واقعات ظہور میں آ چکے تھے۔ ہند و پاک کے درمیان دو مرتبہ جنگ ہو چکی تھی۔ پہلی مرتبہ کچھ میں اور دوسری مرتبہ پنجاب اور کشمیر میں۔ اس دوران زلفی کی قسمت کا ستارہ کبھی چمکا اور کبھی گردش میں آیا۔ کہاں تو زلفی ایوب کے مخصوص عزیز وزیروں میں سے تھا۔ کہاں وہ ایوب کے قہر کا نشانہ بن گیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ایوب کے دل میں زلفی کے لیے حسد پیدا ہو گیا تھا اور وہ اسے اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ زلفی نے تاشقند قرارداد کی کھلے بندوں مخالف کی تھی اور اسی کی بدولت ایوب کو ناراض کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایوب نے بھٹو کو قریب قریب جلاوطن کر دیا۔ جہاں سے بھٹو نے ایک عظیم جدوجہد کی شروعات کی۔ اس نے دو فوجی آمروں کو شکست دی اور پاکستان میں غیر فوجی حکومت قائم کی۔

گیارھواں باب

1965ء کی جنگ

1965ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جھگڑے کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ یہ آج تک پس پردہ ہے۔ کئی سیاسی نقادوں اور اخبار نویسوں نے کئی امکان اور سمجھ میں آنے والی وجوہات بیان کی ہیں اور کہا ہے کہ کشمیر جیسے پرانے مسئلے کو حل کرنے کے لیے پاکستان نے وہ خاص موقعہ کیوں منتخب کیا۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اگر میں چاہوں تو میں بھی اسی طرح کی ایک وجہ بتا سکتا ہوں مگر کیا فائدہ۔ 1965ء میں واقعات اس تیزی کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے جھگڑے کی سمت بڑھ رہے تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں ہی ملک عملی طور پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

ساری مشکل ہوئی کہ ہندوستان نے چین کے ساتھ سرحد کے متعلق سمجھوتا کرنے میں دشواری محسوس کی۔ پنڈت نہرو نے اس بات سے انکار کر دیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کے بارے میں کوئی جھگڑا ہے۔ ادھر چواین لائی برابر یہ کہتے رہے کہ ہندوستان اور چین آپسی بات چیت اور صلاح مشورہ سے اپنی حدیں طے کر لیں گے۔ ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ ظہور میں آتا گیا اور اس سے پہلے کہ ہم حقیقت کو سمجھ پاتے ہندوستانی عوام بے حد جذباتی ہو اٹھی۔ اس نے چین پر دھوکا دہی کا الزام لگایا اور کہا کہ وہ پرانے دستور کو توڑ رہا ہے۔ چین کے ساتھ جنگ کے جو خوفناک نتائج برآمد ہوئے اور ہمارے فوجی انتظام اور جنگ کے طریقوں کی جو زبردست غلطیاں اور خامیاں سامنے آئیں اور جن سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں حکومت تھی انہوں نے ایسا رویہ اختیار کیا جو تہذیب اور اخلاق کے خلاف تھا۔ ان سب کی وجہ سے ہندوستان کو پہل کرنے کی پالیسی اختیار کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ہمارے فوجی جوانوں کے پاس کافی ساز و سامان نہ تھا اور نہ وہ جنگ کے لئے تیار ہی تھے۔ پھر بھی انہیں آگے کی چوکیوں پر جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالنی پڑی۔ ان کے کمانڈر اس طرح کے تھے جن پر سیاسی اثر بہت زیادہ تھا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ ہونا ضروری تھا۔ برما اور پاکستان نے بغیر کسی پریشانی کے چین کے ساتھ اپنی حدوں کے جھگڑے حل کر لئے اور ایک مضبوط حد بندی قائم کرالی۔ لیکن ہم چین کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کر پائے۔

یہی ایک ایسا موقعہ تھا جب بھٹو نے چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اور بھی گہرے اور وسیع بنانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ خود اس کا بیان ہے کہ اسے اس میں فائدہ نظر آیا اور اس نے یہ محسوس کیا کہ اس سے پاکستان کو اپنے ان تعلقات کو اہم وزن کرنے میں مدد ملے گی جو امریکہ، سیٹو اور سینٹو کی فوجی قراردادوں کے وجہ سے توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ایوب خان اور چواین لائی شاہی سفر پر چین اور پاکستان آئے گئے۔ بھٹو مسلسل اسی کوشش میں رہا کہ کسی طرح چین کو خوش کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان نے امریکی اثر کے جواب میں ایک عملی کام کر لیا اور سوویت روس کو آگاہ کر دیا۔

پاکستان کو مسلسل یہ خوف تھا کہ ہندوستان بہت زیادہ طاقتور ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس نے فوجی ساز و سامان اور اسلحہ بنانے اور حاصل کرنے کا پروگرام بڑے پیمانہ پر شروع کر دیا ہے۔ اس کام میں ہندوستان کو امریکہ اور برطانیہ سے بھی مدد مل رہی ہے کیونکہ یہ دونوں ملک چاہتے تھے کہ ہمالیہ کے شمال میں کمیونسٹوں کی حدوں کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ حضرت بل کے واقعہ کے بعد کشمیر میں جو بدامنی پیدا ہوئی اور جب موئے مبارک مسجد سے غائب ملا اور شیخ عبداللہ کو جنہیں لوگ کشمیر کا قدرتی اور ایسا لیڈر مانتے ہیں جس کے لیدر ہونے میں کسی کو نہ اعتراض ہے اور نہ اختلاف، گیارہ سال کی نظر بندی کے بعد رہا کر دیا گیا تو پاکستان کو یقین ہو گیا کہ یہی وہ وقت ہے جب انہیں کشمیر میں پھر ایک مرتبہ بغاوت کا پرچم بلند کرا دینا چاہیے۔ یہ بات پھیلائی گئی کہ اب پنڈت نہرو نہیں ہیں اور ہندوستان کی حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو

کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔اس سے پاکستان کو اور حوصلہ ملا کہ وہ ہندوستان کے خلاف جنگ چھیڑ دے۔اس نے پہلے کچھ میں معمولی سا جھگڑا کیا۔یہ بھارت کے ساتھ وسیع پیمانہ پر جنگ کی شروعات تھی۔

حالات کی تشریح کرنے میں بھٹو نے ضرور اہم رول ادا کیا ہوگا۔حالانکہ بعد میں کوشش کر کے اس نے خود کو 1965ء کی جنگ سے بالکل علیحدہ کر لیا۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے عوام کا خیال ہے کہ بھٹو نے ضرور ایوب اور اس کی سرکار کو ہندوستان کے خلاف جنگ چیڑنے کے لئے بھڑکایا ہوگا اور جنگ چھیڑنے کی جو بناء بنائی ہوگی ہو یہی ہوگی کہ یہی موقعہ ہے جب کہ پاکستان کو جنگ چھیڑ دینی چاہیے۔میں بھٹو سے جس حد تک واقف ہوں اس کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ اس نے دلائل پیش کر کے جنگ کی ضرورت ثابت کر دی ہو۔ان باتوں سے ایوب خان نے بھی فیصلہ کر لیا ہوگا کہ یہی وقت ہے جب پاکستان کو ہندوستان کے خلاف جنگ چھیڑ دینی چاہیے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی عوام کا سمجھدار طبقہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ پاکستانی مسلح فوجیں ہندوستان سے لوہا منوا لینے کے لئے پوری طرح ساز و سامان سے لیس ہیں اور کشمیر کو آزاد کرا سکتی ہیں۔اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ پاکستان کے پاس بہتر ساز و سامان تھا۔ہم سب جانتے ہیں کہ 1965ء کی جنگ کا خاتمہ ہندوستان کی اخلاقی فتح کے ساتھ ساتھ اس کے منصفانہ نظریہ کا ثبوت بھی تھا۔اس لئے نہیں کہ ہندوستان نے پاکستانی حملے کو روک دیا تھا۔بلکہ اس نے پاکستان سے وہ مفاد چین لیے تھے جو پاکستان کے پاس بہتر جنگی ساز و سامان ہونے کی وجہ سے اسے حاصل تھے۔اس کے ساتھ ہی پاکستان نے ہندوستان کے جن علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا وہ بھی اسے چھوڑنے پڑے تھے۔

اس سے ایک بنیادی سوال پیدا ہوا ہے۔انڈسٹری کے اعتبار سے ہندوستان کافی بڑا ملک ہے۔کیا ایسی صورت میں پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جنگ چھیڑنے کی طاقت ہے،اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا فوج جو سیاست میں بری طرح گھسی ہوئی ہو جنگ کر سکتی ہے؟اس سلسلے میں مصر کی مثال دی جا سکتی ہے۔مصر کی فوجوں کو اسرائیلی فوجوں کے مقابلے میں جو کراری مات کھانی پڑی وہ اس کی ایک بہتر مثال ہے پھر بھی پاکستان میں یقینی طور پر عوام کا ایک ایسا طبقہ تھا جو پروپیگنڈہ اور پبلسٹی سے متاثر تھا اور جس کی یہ رائے تھی کہ 1965ء کی جنگ میں پاکستان کی شاندار فتح ہوئی۔1971ء کی جنگ مین دونوں ملک برابر رہے۔پاکستان نے جھگڑے کی پالیسی اور جنگ کا رویہ اختیار کیا۔اس کی وجہ اسی طرح کا پروپیگنڈا ہے،جس کی بناء پر حالات کا غلط جائزہ پیش کیا گیا اور کاروائی کی گئی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جس حد تک اس ماحول کو تیار کرنے میں مدد دی۔اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے خیالات میں کس قدر پختگی ہے۔لیکن 1971ء میں زلفی نے پہلے کی نسبت زیادہ متوازی رویہ اختیار کیا۔اسے پاکستان کی جنگ کرنے کی طاقت بھی اچھی طرح معلوم تھی۔حقیقت معلوم تھی۔حقیقت معلوم ہونے کے بعد زلفی کے حملہ آور نظریہ میں کچھ کمی ہوئی یا نہیں،یہ اندازہ کا موضوع ہے۔لیکن اس احساس نے اس کے خیالوں میں پختگی پیدا کر دی۔وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ مسئلے کو جنگ کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے یہ کہنا کم کر دیا کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کر سکتا ہے۔جب اس کے اس بیان کی تیزی اور گرمی ختم ہو گئی۔تو اس نے اپنے اس بیان کی صفائی دی کہ یہ تو تاریخی،فلسفی اور مسلم قوم کے پیدائشی جنگ جو ہونے کی وجہ سے ایک خیال اور تصور تھا۔اس کے معنی صرف یہ تھے کہ ہمارا ملک کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔جو بھی ہو۔کوئی بھی شخص اس طرح کے بیانات کو سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔کیونکہ جو شخص ہزار سال کی جنگ کرنے کی بات کہہ سکتا ہے اسے ہزار سال کے امن کی بات کہتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو اسے اس بات قطعی کوئی غرض نہیں کہ مسٹر بھٹو جو کہتے ہیں کیا ان کا مطلب وہی ہے یا وہ اوقعی امن چاہتے ہیں یا نہیں۔اس سے تو زیادہ ضرورت اس بات کا پتہ لگانے کی ہے کہ گذشتہ دس سالوں کی حقیقتوں کو انہوں نے سمجھا ہے یا نہیں۔اور اگر سمجھا ہے تو کیا وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی مسئلے کا حل جنگ نہیں ہے اور مسئلہ حل کرنے کے اس ذریعے کو ختم کیا جاتا چاہیے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے جو نتائج سامنے آئے،انہوں نے ایوب کی فوجی سرکار کی عزت دھول میں ملادی۔لوگ سمجھنے لگے کہ فوج کی چستی پھرتی اور چمک دمک لیڈروں کی غیر وفاداری اور موقعہ پرستی سے چھٹکارا پانے کا ایک محدود جواب ہے۔کوئی سرکار اس بات کی گارنٹی نہیں دے سکتی کہ وہ بہترین جنگ لڑسکتی ہے۔پاکستان کو فوجی حکومت کے تجربہ سے صرف یہ بات معلوم ہوسکی کہ جس ملک کی فوج کے ہاتھ میں حکومت آجاتی ہے وہ ناقص ہوجاتی ہے،عیش پرست ہوجاتی ہے،اور آرام وہ زندگی کی عادی ہوجاتی ہے۔اسی لیے وہ جنگ کرنے کی طاقت اور صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی شکست کے بعد فوجی حکومت کے خلاف طلبہ نے وسیع پیمانے پر مظاہرے کئے۔یہ مظاہرے کچھ حد تک اس حقیقت کے احساس کا ثبوت تھے۔

ہندو پاک جنگ کا نتیجہ بھٹو اور ایوب کے درمیان اختلاف کی صورت میں سامنے آیا اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بھٹو اور ایوب کے اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ ایوب نے جنگ کا جو طریقہ اختیار کیا اس میں خامیاں اور غلطیاں تھیں یا بھٹو کی سیاسی سمجھداری اور ہوشیاری انہیں اس بات کے لئے مجبور کررہی تھی کہ وہ خود کو جنگ کی ذمہ داری سے بری کرلیں۔یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید کبھی نہیں مل سکے گا۔

بارھواں باب

دو لیڈر۔ دو راستے

جنگ کے بعد تاشقند کانفرنس ہوئی۔ ایوب اور بھٹو کے درمیان اختلافات کافی گہرے ہو چکے تھے۔ بھٹو نے کئی مرتب استعفیٰ دینے کی پیشکش کی۔ لیکن ایوب نے بھٹو کو عہدے سے برطرف کرنے سے انکار کر دیا۔ ایوب کی خواہش تھی کہ اگر بھٹو پاکستان کی ناکامیابی کی کوئی قیمت نہیں ادا کرتے تو نہکریں لیکن کم از کم پاکستان کی شکست کی کچھ ذمہ داری تو اپنے کندھوں پر لیں۔ بھٹو نے جنگ اور تاشقند کانفرنس کے درمیان کا زیادہ تر وقت اقوام متحدہ میں گزرا۔ جہاں انہوں نے کشمیر کے متعلق پاکستان کے دعوے کو مناسب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ بھٹو اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ایوب کا اعتماد کھو بیٹھے تھے اور دونوں کے دلوں ایک دوسرے کے لئے شک پیدا ہو چکا تھا۔ ایوب نے محسوس کر لیا تھا کہ بھٹو ان کی جگہ لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ لیکن اس احساس سے حالات کو خوشگوار بنانے میں مدد نہیں ملی۔ جب ایوب بھٹو کو اپنے ساتھ تاشقند لے گئے تو بھٹو کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس بات سے ایوب کا ناراض ہونا قدرتی تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ تاشقند بات چیت میں بھٹو پوری طرح ساتھ نہیں دے رہے۔ تاشقند اعلان پر دستخط ہو جانے کے بعد بھٹو نے اس بات کی کچھ کوشش کی کہ لوگ تاشقند قرارداد کو تسلیم کر لیں۔ اس سلسلے میں بھٹو نے 15 جنوری 1966ء کو اور پھر 9 فروری 1966ء کو لاڑکانہ میں دو مرتبہ پریس کانفرنس بلائی تھی۔

اس وقت تک جنگ کے خاتمے کے بعد ہونے والے طلبہ کے مظاہروں کی تیزی اور تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایوب وزارت میں وزیر خارجہ ہونے کی وجہ سے بھٹو سے کہا گیا کہ وہ سرکار کی پالیسی کی حمایت کریں۔ لیکن بھٹو کا دل ان پالیسیوں کی تائید کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ جب ہندوستان کے ساتھ جھگڑا سیاست دانوں کا کھیل بنا ہوا تھا۔ بھٹو کی اندرونی ہمدردی اس تحریک کے ساتھ تھی جس کا کوئی لیڈر نہ تھا۔ پھر بھی وہ تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس بات سے بہت پریشان تھے کہ وزیر خارجہ ہونے کی وجہ سے وہ خاموش تماش بین بنے بیٹھے ہیں۔ ایوب بھٹو کو استعفیٰ دینے نہیں دے رہا تھا۔ اور اس طرح انہیں اس تحریک میں حصہ لینے سے روک رہا تھا۔ دراصل بھٹو ایوب سرکار کے قیدی بن گئے تھے۔ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے ذرا سی بھی شرارت کی تو اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے اور انہیں بھگتنے پڑیں گے۔ حالات ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے۔ مغربی پاکستان کے عوام محسوس کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ ان حالات میں ایوب کو اپنی مقبولیت ختم ہوتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

مغربی پاکستان کی تحریکوں کو کم کرنے کے لئے ایوب نے یہ ضروری سمجھا کہ عوام کے خیالوں کا رخ مشرقی پاکستان کی طرف موڑ دیا جائے۔ انہوں نے کوشش کی کہ مشرقی پاکستان کے عوام تاشقند اعلان کا خیر مقدم کریں۔ اس سے مغربی پاکستان کی تحریکوں کو جواب دیا جا سکے گا۔ جو بھی ہو۔ کشمیر کے مسئلے میں مشرقی پاکستان کے عوام کی کوئی دل چسپی نہ تھی۔ بنگالیوں کی یہ شکایت بدستور قائم تھی کہ انہیں ترقی کے کاموں کے لئے روپیہ نہیں دیا جاتا جب کہ کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے فوجی سامان خریدنے کے واسطے مسلسل زیادہ رقم جمع کی جاتی ہے۔ وہ اس لئے بھی ناخوش تھے کہ انہیں 1965ء کی جنگ کے دوران برار ہندوستان اور چینی حملے کے خطرے کا مقابلہ کرنا پڑا اور ان کی حفاظت اور سلامتی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

زیادہ تنقید نہ بھی کی جائے تو بھی یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ایوب نے مشرقی پاکستان کے سلسلے میں جو نظریہ اختیار کیا وہ نہایت بھونڈا تھا۔ اس کام کے لئے ایوب نے کالاباغ کے نواب کی خدمات حاصل کیں جو مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ اسکیم یہ بنائی گئی کہ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے اور خاص لیڈروں کو تلاش کر کے بلایا جائے اور انہیں کسی طرح کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ اسکیم کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ

شیخ مجیب الرحمٰن کی خوب پبلسٹی کی جائے اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جس سے کہ وہ کود کو بہت ہی اہم لیدر سمجھنے لگیں۔لیکن اس کام کے لئے نواب کالا باغ کا انتخاب بہت ہی غلط تھا۔ وہ اس طرح کی اسکیم کو لاگو نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود گھسے پٹے جاگیردار طبقے کے تھے اور دوراندیش نہیں تھے۔اس کے علاوہ انسانی کمزوریوں کی طرف سے بھی وہ لاپروار ہتے تھے۔اکثر مذاق میں یہ کہا جاتا تھا کہ نواب کالا باغ پورے صوبے کو اپنی نسوار کی ڈبیہ میں رکھتے ہیں کیونکہ یہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ایک مرتبہ تو انہوں نے یہ بھی شیخی بگھاری تھی کہ مغربی پاکستان اس براعظم کا جرمنی ہے اور اس میں صرف ایک ہی قوم اور نسل کے اور ایک ہی خیال کے لوگ رہتے ہیں۔

ہر سیاسی جماعت نے عوام میں پھیلی ہوئی بدامنی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور سبھی مخالف پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس ہوئی۔اس کانفرنس کا نام آل پاکستان نیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ یہ کانفرنس ہوئی۔اس کانفرنس کا نام آل پاکستان نیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ یہ کانفرنس لاہور میں بلائی گئی۔اس کا مقصد ایوب کی مخالفت کرنا تھا۔شیخ مجیب الرحمٰن ے بھی اس کانفرنس میں حصہ لیا اور انہوں نے یکا یک چھ پوائنٹس فارمولا مطالبہ کی شکل میں پیش کر کے س کو حیرت زدہ کر دیا۔

یہ چھ پوائنٹس فارمولہ کس نے تیار کیا۔ یہ ابھی تک طے نہیں ہے۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ اس کام میں کراچی میں رہنے والے سفیر تجارت کا ہاتھ تھا۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام ایوب کے نوکر شاہ افسر الطاف گوہر کا تھا اور بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ کام کسی اخبار نویس کا تھا۔ بہر حال جو بھی ہو جہاں تک دنیا کا سوال ہے دنیا کا یہی خیال ہے کہ یہ فارمولا شیخ مجیب الرحمٰن نے تیار کیا تھا۔ یہ فارمولہ ایوب کی اس تازہ سکیم کے مطابق تھا جو مشرقی پاکستان کو خوش کرنیکے لئے وہ لاگو کرنا چاہتے تھے۔سرکاری اخبارات نے مجیب کے مطالبات کی خوب پبلسٹی کی۔اس کے ساتھ ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اس کا خوب پروپیگنڈا ہوا۔شیخ مجیب کانفرنس کے بعد ڈھاکہ واپس چلے گئے۔اگلے تین مہینوں تک یعنی فروری، مارچ اور اپریل 1966ء تک انہوں نے اس فارمولہ کی خوب پبلسٹی کی۔سرکار نے بھی اپنے مخصوص ذرائع سے اس دورہ کی خوب پبلسٹی کی اور راتوں رات، مشکل سے کل تین مہینے کے اندر ہی مجیب مشرقی بنگال کے عظیم لیڈر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آ گئے۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ مشرقی پاکستان ایک نو آبادی بن کر رہ گیا تھا اور اسے بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ مشکلات اور تکلیفیں ویسی ہی تھی جو اکثر مظلوم نو آبادی میں پائی جاتی ہیں۔مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان کی آبادی سے زیادہ تھی۔لیکن شروع کے چند سالوں تک اسے پورے ریونیو کا 11 فیصد ہی ملتا رہا۔اسکولوں کے معاملے میں مشرقی پاکستان بہت محروم تھا۔مغربی پاکستان میں اسکولوں کی تعداد میں آٹھ گنا اضافہ ہو چکا تھا جب کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ فارن ایکس چینج کماتا تھا۔لیکن اسے ترقی کے کاموں کے لیے اس حصے سے بھی کم روپیہ دیا جاتا تھا جو منصفانہ طور پر اسے ملنا چاہیے تھا۔اس طرح کی ناانصافی لائسنسوں، کوٹوں اور پرمٹوں کے معاملے میں بھی دیکھنے میں آتی تھی۔ بنگال میں جو چاول پیدا ہوتا تھا وہ خود بنگال میں مہنگا تھا اور مغربی پاکستان میں سستا تھا۔اس طرح کی شکایتوں کی فہرست اس قدر لمبی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔

اس سوتیلے برتاؤ کی وجہ سے مشرقی بنگال کے لوگوں مین گہری بدامنی غم وغصہ اور تشدد پیدا ہو گیا تھا اور وہاں کئی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔اس نظر سے برابری کے برتاؤ کے مطالبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ برابری کی یہ دوڑ پاکستان کے دونوں حصوں میں شروع ہو گئی۔توازن ختم ہو جانے کی وجہسے دونوں حصوں میں بے چینی پھیل گئی۔ یہ حالت شروع سے ہی تھی۔مغربی پاکستان ہمیشہ مشرقی پاکستان پر حاوی رہتا تھا۔اس میں مغربی پاکستان کا خاص طور پر پنجاب کا زیادہ ہاتھ تھا۔مشرقی پاکستان کو اس طرح بہت ہی ظالمانہ طریقے سے چوسا جا رہا تھا۔

کچھ مدت بعد یکساں نمائندگی کا مطالبہ اس قدر زیادہ بڑھ گیا کہ ہر ڈیلی گیشن میں، ہر جماعت میں اور ہر ادارہ میں نمائندگی برابر ہونا ضروری مانا جانے لگا۔ اگر مغربی پاکستان مُں کوئی کارخانہ کھلتا تو ویسا ہی کارخانہ مشرقی پاکستان میں کھلنا ضروری تھا۔ اگر ایک پٹرول پمپ مغربی پاکستان میں کھلتا تو دوسرا پٹرول پمپ مشرقی پاکستان میں کھولا جانا لازمی تھا۔ یہ حالت مضحکہ خیز بھی تھی اور ناقابل برداشت بھی۔ اس حالت کا تاثر مغربی پاکستان سے شروع ہوا۔ وہاں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ضروریات سے زیادہ رعایتی برتاؤ کیا جارہا ہے۔ لوگوں میں تو تو میں میں شروع ہوگئی اور آپسی بات چیت میں یہ کہا جانے لگا کہ پاکستان کا مشرقی حصہ ملک کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

اس طرح کی باتوں کو روکنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ باتیں اخباروں میں شائع نہی کی جاسکتی تھیں۔ مگر مشرقی پاکستان کی شکایت بدستور قائم رہی وجہ تو تھی ہی۔ ایوب نے اپنی لاپروائی سے ایک نئی حالت پیدا کردی اور مشرقی پاکستان کو ایک ایسا لیڈر دے دیا جس کے پاس حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے لیے چھ پوائنٹس فارمولہ تھا۔ یہ شخص مشرقی پاکستان کا مخصوص نمائندہ بن گیا اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوگیا۔ اب مشرقی پاکستان کے مطالبات زیادہ سلجھے ہوئے طریقے سے سامنے آنے لگے۔ اس سے ایوب پریشان ہوا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پورے ملک کے لئے ایک باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے مشرقی پاکستان کے عوام ان کو خدا کا دیا ہوا مقام نہ دے کر احسان فراموشی کررہے ہیں۔

حالات سدھرنے تو درکنار الٹے تیزی سے بگڑتے چلے گئے۔ مغربی پاکستان مین تاشقند قرارداد کے خلاف تحریکیں اور بھی گہری ہوگئی اور مشرقی پاکستان میں خطرناک طور سے خودمختیاری کا مطالبہ قلانچیں بھرنے لگا۔

اس حالت سے ایوب گھبرا اٹھے اور انہوں نے صلاح مشورہ کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کو بلایا۔ بھٹو نے مشورہ دیا کہ تمام کونسلروں کی ایک بیٹھک بلائی جائے اور اس میں چھ پوائنٹس پروگرام کی بابت عوام میں بحث چھڑا سکتے ہیں۔ بھٹو کو مکمل یقین تھا کہ وہ اس چھ پوائنٹس پروگرام کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اس کے بعد عوام خود فیصلہ کرلیں گے۔ ایسا محسوس ہوا کہ ایوب نے بھٹو کی رائے تسلیم کرلی۔ لیکن ایوب کے خاص مشیران کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور انہوں نے ان کے دل میں بھٹو کے خلاف زہر بھرنا شروع کردیا۔ انہوں نے کہا کہ بھٹو اپنی عزت و مقبولیت کو پھر سے حاصل کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ پارٹی کونسلروں کی بیٹھک میں صدر کی حیثیت سے ایوب نے فوجی آمر جیسی تقریری کی۔ چھ پوائنٹس فارمولہ کے سلسلے میں ملک گیر پیمانے پر بحث شروع کرنے کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ آخر مُں کہا کہ بحث کا وقت اب ختم ہو چکا ہے اور صرف ہتھیاروں کی زبان کا ہی کچھ اثر ہو سکے گا۔

بھٹو کو ایوب کے اس فوج شاہی رویئے پر سخت تعجب ہوا۔ کیونکہ ایوب نے جن باتوں کا ذکر اپنی تقریر میں کیا تھا وہ اس صلاح کے قطعی خلاف تھیں۔ جو بھٹو نے انہیں دی تھی۔ ایوب کی تقریر کے بعد سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے بھٹو کو تقریر کرنی تھی۔ انہوں نے ایوب کی تنقید کی اور ایوب نے جو رائے دی تھی اس کی تائید نہیں کی۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ میں تو نہیں سمجھتا کہ ہتھیاروں کی زبان کچھ کارگر ثابت ہو سکے گی۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر زبان کا ہتھیار استعمال کیا جائے تو اس کی کامیابی کا بہترین موقعہ ہے۔

بھٹو کی تقریر سن کر ایوب بہت لال پیلے ہوئے انہوں نے اس بات کے لئے بھٹو کی کڑی تنقید کی کہ اس نے صدر پر چھینٹا کشی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں اور میری پالیسی کے مطابق مجیب کو جیل میں بند کردیا جائے گا۔ تعجب کی بات تھی کہ مجیب کی گرفتاری کے حکم پر کسی نے چوں تک نہ کی۔ مجیب کی گرفتاری پر نارائن گنج جوٹ مل کے چند مزدوروں نے مظاہرہ کیا اور وہاں تین چار آدمی مارے گئے۔ ممکن ہے یہ مظاہرہ بھی مجیب کی گرفتاری کی وجہ سے نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس فساد کے بعد کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔

گذشتہ چند مہینوں میں ایوب اور بھٹو کے درمیان شاید ہی کوئی بات چیت ہوئی۔ کونسلروں کی بیٹھک کے بعد بھٹو کو بڑی خاموشی کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور زبردستی چھٹی دے کر یورپ بھیج دیا گیا۔ بھٹو جب یورپ میں تھا تو ایوب نے اسے نیچا دکھانے کے لیے وسیع پیمانے پر اس کے خلاف مہم شروع کر دی تا کہ بھٹو عوام کی نظروں سے گر جائے اور لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ اکتوبر 1966ء میں چار مہینے بعد بھٹو واپس آیا تو اس کے پاس وزیر خارجہ کا عہدہ تھا نہ حکومت۔

واپس آنے کے فوراً بعد بھٹو ڈھاکہ گیا۔ وہاں اس نے انجینئرنگ کالج میں طلباء کے سامنے تقریر کی۔ یہ جگہ عوامی لیگ کا ہیڈ کوارٹر تسلیم کی جاتی تھی۔ اپنی تقریر میں بھٹو نے مجیب کے چھ پوائنٹس پروگرام کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس کے ہر پوائنٹ کی تشریح کی اور خوب بخیے ادھیڑے۔ بھٹو کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ طلباء اس سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے خوش ہو کر کافی دیر تک تالیاں بجا کر جذبہ احترام کا مظاہرہ کیا۔

اپنے اس دورے میں بھٹو نے دیکھا کہ مجیب کے چھ پوائنٹس پروگرام کو چند لوگوں کی ہی تائید اور تعاون حاصل ہے جن میں طلبہ اور تجار بھی ہیں۔ لیکن دیہاتی علاقوں میں اس پروگرام کی تائید کرنے والا شاید ہی کوئی ہو۔ مزدور طبقوں میں تو کوئی اسے درست ماننا ہی نہیں تھا۔

اس موقعے پر ایسا محسوس ہوا کہ صدر ایوب کی طاقت مغرب کے مقابلے میں مشرق میں زیادہ ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ شاید ایک لمبے عرصے کے بعد سرکار یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ واقعی مشرقی پاکستان کو اب تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اب سرکار اس کی ترقی کے کاموں کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم دے کر اسے آگے بڑھانا چاہتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں بڑی تعداد میں لائسنس، کوٹے اور پرمٹ دیئے گئے۔

بھٹو کے خیال سے مولانا بھاشانی کا اب بھی مشرقی پاکستان کے مشرقی حصے میں اثر تھا اور یہ اثر شیخ مجیب کے اثر سے کہیں زیادہ تھا۔ بھٹو نے یہ بھی محسوس کیا کہ بھاشانی اور ایوب کے درمیان کوئی اقرار ہو چکا ہے جسے سمجھ پانے میں بھٹو کو کامیابی نہیں ملی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ قرار نواب کالاباغ نے کرایا ہوگا۔

بھٹو بہت مایوس ہو کر مغربی پاکستان میں واپس آیا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ایوب کو کس طرح کرسی سے دھکیلا جائے۔ تقریباً ایک سال گزر گیا۔

1967ء کے پورے سال مین بھٹو اپنی مایوسی پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس سلسلے میں اس نے کافی غور و خوض کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ پاکستان میں سیاسی انقلاب کی شروعات کس طرح کی جائے۔

1967ء کے آخر میں اگرتلا سازش کیس کا پتہ لگا۔ اس وقت لوگوں نے رائے زنی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کا بھی اس میں ہاتھ تھا۔ جو بھی ہو۔ کم از کم ایوب اس بات سے مطمئن تھے کہ مجیب کو اس معاملے میں لپیٹا جا سکتا ہے۔ موقعے کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایوب نے سوچا کہ یہ سنہری موقعہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ انہیں اپنی چال پر اس قدر بھروسہ تھا کہ انہوں نے مجیب پر کھلے عام مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب بھٹو نے یہ سنا تو اس پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ اسے صدمہ پہنچا کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ مقدمے کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن کھلے عام مقدمہ چلانے سے مجیب کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ یہ درست تھا۔ جوں جوں مقدمہ چلتا گیا۔ مجیب کی مقبولیت میں دن دگنا رات چوگنا اضافہ ہوتا گیا۔ یہ مقدمہ مہینوں تک چلتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجیب مشرقی پاکستان کے ہیرو بن گئے اور ایوب کی مقبولیت کو خاصی چوٹ پہنچی۔

زلفی کیلئے خاموش بیٹھ کر جائزہ لیتے رہنے کے دن ختم ہو چکے تھے۔ اب خاموشی سے تماشہ دیکھنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے والد نے اسے تلقین کی تھی کہ صحیح وقت کا انتظار کرو۔ جب یہ موقعہ آیا تو زلفی نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنی

سیاسی پارٹی کا کام شروع کر دیا۔اس معاملے مین نہ تو اس نے خود کو بخشا اور نہ اپنے دوستوں کو۔

1967ء کے آخر تک بھٹو نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک تبدیل کرنا چاہیے۔اس کے لئے ایک نئی سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے اور وہی یہ کام کر سکتی ہے۔وہ مہینوں سے اس کی بات سوچ رہا تھا۔اسکیمیں بنا رہا تھا اور جب اس نے تہیہ کر لیا تو اس نے اس پر اپنی پوری ذہنی طاقت صرف کر ڈالی۔خود کو اور اپنے ساتھیوں کو پوری طاقت کے ساتھ اس نے اس کام میں جوت دیا۔اس کی جی توڑ کوشش تب تک جاری رہی جب تک کہ نئی پارٹی نہیں بن گئی۔

نئی پارٹی کی اختتامیہ بیٹھک میں پارٹی کی بنیاد کے متعلق کئی کاغذات جاری کئے گئے۔جن میں چند اصول تھے جو پارٹی کے راہبر تھے۔ان پر بھٹو کے غور وخوض، کیریکٹر اور کردار کے دائمی نقوش تھے۔شاید اسی نے تمام کاغذات تیار کئے تھے۔نئی پارٹی کی ضرورت بتاتے ہوئے اس کی بنیاد ڈالنے والوں نے محسوس کیا کہ پاکستان بیس سال کے بعد ایک نئی شکل وصورت اختیار کرنے جا رہا ہے۔لیکن اس کے بنیادی مسائل ابھی تک بدستور قائم تھے۔ان سے بارہ کروڑ عوام کی قسمت کا مستقبل غیر یقینی ہے،بھٹو نے ہمیشہ کی طرح ڈرامہ کیا اور اس کے ذریعے اپنے ملک کی خامیوں کی طرف بہت ہی بہتر الفاظ میں اشارہ کیا۔دراصل اس نے اپنی بات اس قدر منہ پھٹ طریقے سے بیان کی تھی کہ جو بھی اس پارٹی کے راہبر اصولوں کا مطالع کرتا وہ صاف سمجھ جاتا کہ بھٹو نے اب پیچھے نہ لوٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ پرانی حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔

بھٹو نے محسوس کیا کہ پاکستان میں نہ صرف کرپشن کنبہ پروری پھیلی ہوئی ہے بلکہ عوام کی سماجی زندگی میں بھی غلاظت گہرائی تک داخل ہوگئی ہے۔اس کا اثر قانون اور انتظامیہ پر بھی پڑا ہے۔مزدوروں کے حقوق ان کی امیدیں،ان کے خواب کی طرف سرکار کی توجہ درکنار نظر تک نہیں ہے۔عوام کی تکلیفیں بڑھتی جا رہی ہیں۔

دنیا میں کام اور پیداوار کا جو پیمانہ ہے وہ پاکستان میں مسلسل گرتا جا رہا ہے۔کسانوں اور مزدوروں کو صحیح اور مناسب مشورے نہیں حاصل ہو رہے۔درمیانی طبقہ اور نوکری پیشہ طبقہ کے لوگ ایسی حالت محسوس کر رہے ہیں جہاں وہ خود کو ضروریات زندگی خرید پانے میں بے بس محسوس کرتے ہیں۔تنگ نظری نے پورے سماج کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے تعلیمی معیار گیا گزرا ہو گیا ہے اور سبھی قومی ادارے اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔صرف عدالتیں اور مسلح فوجیں ضرور اس سے بچی ہوئیں ہیں۔پاکستان فوجی حکومت لاگو کو دیئے جانے کے بعد بھی اس کی بیماریوں اور برائیوں کا کوئی مستقل علاج تلاش نہیں کیا جا سکا۔1962ء میں جب مارشل لاء ہٹا لیا گیا تو جو حکومت آئی اس میں جمہوریت بہت کم تھی اور آمریت زیادہ تھی۔1962ء کے بعد حالت اور بدتری ہوتی گئی۔عدالتیں کمزور ہو گئیں۔جرم اور خون خابے کے پچھلے تمام رکارڈ توڑ دیے گئے۔انڈسٹری کی ترقی تو ضرور ہوئی لیکن کھیتی کی پیداور گھٹ گئی اور اس سے مالی مصیبت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔باہری ملکوں سے بہت بڑی تعداد میں اناج منگانا پڑا۔اس سے فارن کرنسی کا محفوظ خزانہ تقریباً خالی ہو گیا۔مزدوروں میں بدامنی پھیل گئی۔روپے کا پھیلاؤ بڑھ گیا۔دانشور اور جوان طبقے کے لوگ ہراسال ہو گئے اور انہیں غلط اور بدتر طریقوں کو اختیار کرنے میں قطعی جھجک نہ رہی۔

اگر واقعی بھٹو یہ یقین کرنے لگا تھا کہ پاکستان کی حالت اس قدر بدتر ہے اور اس قدر ناامید طاری ہے تو سبھی کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسے موقع پر ایک نئی قومی پارٹی کی بنیاد رکھنا بہت بڑی ہمت اور دلیری کا کام تھا۔لیکن ذوالفقار علی بھٹو میں خود اعتمادی کی کمی نہیں رہی۔نہ تو اسے خود پر اور نہ اپنے ملک میں یقین واعتماد کی کمی محسوس کرتے ہوئے دیکھا گیا۔جب زلفی نے نئی پارٹی بنائی تو اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ اعلان کیا کہ مجھے امید ہے کہ سبھی مخالف پارٹیاں ایک ہو جائیں گی جس سے کہ آئینی جدوجہد شروع کی جا سکے اور جمہوریت پھر سے قائم کی جا سکے۔

اس اتحاد کو حاصل کرنے کے لئے بھٹو کی خواہش تھی کہ مخالف پارٹیاں اتفاق کی کڑیاں تلاش کریں۔ اختلاف رائے کی خلیج کو وسیع کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ایک دوسرے کی غیر ضروری تنقید کرنا بند کر دیں۔ ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنایا جائے جس پر تمام مخالف پارٹیاں یکجا ہو سکیں اور قومی سیاسی ترقی اور بیداری کر لئے یکساں نظریہ قائم کر سکیں۔ جس میں نہ پرانی دشمنی کا جذبہ ہو اور نہ ذاتی دشمنی کا۔

بھٹو حکومت اور چند مخالف پارٹیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ اپنی پارٹی کے افتتاحیہ مضمون میں اس نے لکھا تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی تین دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جو آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان تینوں دھڑوں کے درمیان واقع خلیج گھٹنے کے بجائے دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مضمون میں جو کچھ بیان کیا گیا تھا۔ اس کے معنی اعلان جنگ تھا۔

> ''یہ ایک ابھرتی ہوئی طاقتور لوگوں کی پارٹی ہے جو نوجوان طبقے کی رہنمائی کرتی ہے اور یہ پختہ یقین رکھتی ہے کہ پرانے طور طریقے اور روایتی ڈھنگ ان بڑے بڑے مسائل کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن کا آج پاکستان کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اب لوگ ماضی میں واپس نہیں لوٹ سکتے اور نہ اس موجودہ سسٹم کو اور زیادہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ ایک ایسا نیا سسٹم چاہتے ہیں جس کی بنیاد انصاف پر ہو اور جو لاکھوں محنت کش لوگوں کے ضروری مفاد اور بہتری سے وابستہ ہو۔''

زلفی کو ہمیشہ مارکس وادی کشش اور لوگوں کے دل و دماغ کو پکڑنے والے الفاظ پسند ہیں۔

زلفی اس بات پر آمادہ ہو چکا تھا کہ ایسا انقلاب لایا جائے جو ماضی کی بنیادیں تک اکھاڑ پھینکے۔ اس نے کوشش کرتے ہوئے بتایا۔ ''صرف انہیں عناصر کو جو حب الوطنی کی بناء پر قومی مفاد کی شکل میں نظر آئیں گے طاقتور بنایا جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ''سبھی مسئلوں کی رہنمائی قائداعظم محمد علی جناح کی نصیحتیں کریں گی اور اس کی پارٹی قومی مسئلوں کو خداوند تعالی میں اپنے پختہ اعتماد کیساتھ مذہب اسلام کے لئے فخر کا جذبہ رکھتے ہوئے حل کرے گی''۔

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ایوب سرکار نے قوم کی مقبول بنیاد کو نظر انداز کیا ہے اور اس نے صرف انہیں لوگوں کی حالت سدھانے میں امداد دی ہے جو اس طبقے سے وابستہ ہیں جسے مخصوص حقوق حاصل ہیں۔ بھٹو نے فیصلہ کیا کہ وہ اس طرح کی پالیسی کو الٹ دے گا۔ بنیادی مضمونوں میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ پاکستان میں 1976ء میں سب لوگوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے ذرائع حاصل کرنے کے راستے کھلے ہوئے نہیں ہیں۔ دولت مند اور زیادہ دولت مند ہوتے جا رہے ہیں۔ غریب اور زیادہ غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ زمیندار کسانوں کو ان کے حقوق نہیں دیتے۔ پیداوار بڑھانے کے لئے انسانی طاقت کا کارگر طریقے سے استعمال نہیں کیا جاتا۔ قومی سرمایہ چند لوگوں کو مٹھی میں ہے۔ سماجی اور مالی دشواریوں مین اضافہ ہو رہا ہے اور لوگوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

ایوب کو اپنی تنقید اور بدنامی کی مسلسل چلنے والی تحریک پھوٹی آنکھ پسند نہ آئی۔ بھٹو اور اس کی پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ بھی اسے پسند نہ آیا۔ اپنی پارٹی کے افتتاحیہ اجلاس میں بھٹو نے سیاسی آزادی کو فریب بتایا۔ اس نے محسوس کیا کہ عوام میں اس قدر طاقت نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت کو بدل دیں۔ اخباری آزادی گروی رکھی ہوئی ہے۔ عوام کے حقوق پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں اور قومی سیاسی زندگی کو لقوہ مار گیا ہے۔

کشمیر کے متعلق بھٹو کی رائے پاکستان عوام کے رویئے کو ظاہر کرتی ہے۔ ان لوگوں کا دو نیشن کی تھیوری میں پختہ یقین تھا اور اسی وجہ سے وہ گذشتہ بیس سالوں کی تاریخ کو نظر انداز کر رہے تھے۔ کشمیر کے متعلق اس نے جو بکواس کی وہ بیکار کی شیخی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ اس

نے کہا کہ جموں کشمیر کے باشندوں کو اپنا فیصلہ آپ کرنے کا حق نہیں دیا جارہا ہے اور ایک بھگوڑی آمرانہ حکومت اپنی من مانی کررہی ہے۔ ہندوستان ہڑپنے والا ملک ہے جس نے کشمیر پر جبراً قبضہ کررکھا ہے۔ تاریخ وجغرافیائی دونوں نظریوں سے کشمیری عوام پاکستان کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ ہیں۔ چاہے جتنی رکاوٹیں کیوں نہ آئیں انہیں پاکستان میں پھر سے آکر شامل ہوجانا چاہیے۔ جس سے دو نیشن کی تھیوری کا کامیاب ہوسکے۔

1967ء میں بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے قسم کھائی کہ کشمیر کو پاکستان میں ملانے کے کام کو ترجیح دی جائے گی۔ اس سلسلے میں دیگر گھریلو اور دوسرے ملکوں کی ذمہ داریوں پر توجہ بعد میں دی جائیگی۔ پارٹی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرتی رہے گی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرتی رہے گی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ کسی مداخلت برداشت نہ کرے گی خواہ وہ اقوام متحدہ یا کوئی دوسرے ملک کی طاقت ہی کیوں نہ ہو۔

تیرھواں باب

فوجی آمروں سے مقابلہ

ستمبر 1968ء تک بھٹو نے کاروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ستمبر 1968ء کو حیدر آباد (سندھ) میں بھٹو نے پہلی مرتبہ ایوب پر سیدھا وار کیا۔ ایک نہایت جوشیلی تقریر میں اس نے ایوب حکومت کی خامیوں پر زبردست حملہ کیا اور پاکستان کی موجودہ سیاسی حالت کیلئے ایوب کو ذمہ دار قرار دیا اور کہا کہ ایسا ایوب کی غلطیوں اور اپنے فرائض انجام نہ دینے کی وجہ سے ہوا ہے۔

جنرل موسیٰ خان نے بھٹو کے لگائے ہوئے الزامات کا جواب اخبارات کے ذریعہ دیا لیکن وہ نہایت کمزور تھا۔ چار روز بعد 25 ستمبر 1967ء کو بھٹو نے شمال مغربی سرحدی صوبے کا دورہ شروع کیا۔ اس نے تنقیدی حملے جاری رکھے اور ایوب کے اپنے صوبے میں اور بھی زوردار حملہ کیا عوام تک اپنا نظریہ پہنچانے کے لئے اس نے دور دراز علاقوں کا سفر کیا۔ وہ ان کھوہوں، غاروں اور ویران پہاڑوں پر بھی گیا جہاں کسی کے رہنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی اس کے دورے سے نہیں بچے۔ ان مقامات پر کبھی کوئی پاکستانی لیڈر نہیں پہنچا تھا۔ اسے جو بھی سواری ملتی اسی سے سفر کرتا۔ وہ نہ تو خود کو بخش رہا تھا اور نہ ایوب کو۔ اس طرح یہ تاریخی دورہ شروع ہوا جس نے آخر میں ایوب کی ساری عزت اور مقبولیت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اپنے صوبے کے ساتھ تمام ملک میں ایوب کے نام پر عوام تھوکنے لگے۔

5 نومبر 1968ء کو بھٹو پشاور تک پہنچ گیا۔ جہاں اس نے ایک بہت بڑے پبلک جلسے میں تقریر کی اور عوام نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ پشاور کے اس جلسے سے ہی ایوب کو سب سے زیادہ دھکا لگا۔ کیونکہ یہ کام ٹھیک ویسا ہی تھا جیسے کسی شیر کی کچھار میں گھس کر اس پر قابو پالیا جائے۔ ایوب نے بھٹو کے خلاف کاروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بھٹو کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی۔ اسے دھمکایا گیا۔ ایوب نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ خود بھٹو کی تقریر کا جواب پشاور میں ہی دیں گے۔

بھٹو پشاور سے راولپنڈی گیا۔ جہاں اس نے 7 نومبر 1967ء کو ایک بہت بڑے عام جلسے میں تقریر کی۔ ایوب کے حکم سے یہ جلسہ نہ ہونے دیا گیا۔ آنسو گیس چھوڑی گئی۔ گولی چلائی گئی جس سے ایک لڑکا مارا گیا۔

10 نومبر 1986ء کو ایوب نے خود پشاور میں ایک عام جلسے میں تقریر کی۔ بھٹو نے لوگوں میں اس قدر تشدد پیدا کردیا تھا کہ ایوب کو خود آکر تقریر کرنے کی بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بھٹو کی تقریروں نے عوام کے دل میں بھٹو کے لئے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا کردیا تھا۔ لیکن آمروں کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی دقت ہوتی ہے کہ وہ کچھ عرصے کے بعد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں اور کوئی دوسرا شخص مقبول ہو ہی نہیں سکتا اور وہ کوئی غلطی نہیں کرسکتے۔ بہر حال ایوب نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی۔ ''میں کافی عرصے تک بیٹھا بیٹھا ان بے وقوفیوں کو دیکھتا رہا ہوں۔'' لیکن ایوب کو اس سے زیادہ کہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لوگوں نے ہوٹ کرنا اور شور مچانا شروع کردیا۔ اس کے بعد گولی چلی اور جلسہ برخاست کردیا گیا۔

دوسری طرف بھٹو نے دوگنی طاقت سے ایوب پر حملے جاری رکھے وہ ایک اور جلسے میں تقریر کرنے کے لئے 11 نومبر 1968ء کو لاہور گیا۔

یہ بات ایوب کی برداشت سے باہر تھی۔ 13 نومبر 1968ء کو بھٹو کو گرفتار کرکے میانوالی جیل میں بند کردیا گیا۔

لیکن سیاسی حلقے میں بہت کچھ ہو رہا تھا۔ یہ تمام سرگرمیاں بھٹو کے لئے جو اس ڈرامہ کا خاص کردار یا ہیرو تھا بہت ہی اہم تھیں۔ بھٹو کے لئے ہی نہیں بلکہ اس کے ان ساتھیوں کے لئے بھی ان کی اہمیت تھی جنہوں نے مصیبت کے وقت اس کا ساتھ دیا تھا۔ بھٹو نے دو ظالم

آمروں کی مخالفت کی تھی اور ایسے کئی واقعات اس کی نظر سے گزرے تھے جن واقعات کو ظہور میں لانے میں اس نے ہاتھ بھی ہٹایا تھا اور جنہوں نے ملک کی قسمت پر گہرا اثر ڈالا۔

ایوب کی سرکار نے جون 1966ء میں بھٹو کو ڈرامائی انداز میں وزارت سے علیحدہ کر کے یورپ بھیج دیا تھا۔ راولپنڈی سے کراچی تک کے اس کے مشہور سفر کے دوران لوگوں نے نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ یہ ایک ایسا تجربہ اور واقعہ تھا جس کو کبھی بھی بھلایا نہ جا سکے گا۔

جولائی سے اکتوبر 1966ء تک چار مہینے کا جو یورپ کا سفر بھٹو نے ایوب کے دباؤ کی وجہ سے کیا تھا اس کے دوران پاکستان اور میزبان ملکوں نے اس کی ذاتی سرگرمیوں اور زندگی پر کڑی نگاہ رکھی تھی اور جاسوسی تھی یہ اس کی ذاتی آزادی پر واقعی ایک غیر ضروری وار تھا۔

اکتوبر 1966ء میں پاکستان واپس آنے پر بھٹو نے نئے سرے سے کام شروع کرنے کی جی جان سے کوشش کی اور اس لمحے سے لے کر جب تک پاکستان پیپلز پارٹی وجود میں نہیں آ گئی جدوجہد کرتا رہا۔ اس دوران اس نے الگ الگ ڈھنگ سے دانشور طبقے اور عوام کے رویئے کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ اسے پریشان کیا گیا اور اس کے بیان کے مطابق اسے مار ڈالنے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس کے اور اس کے کنبہ کے دیگر لوگوں کے ساتھ عام طور جو برتاؤ کیا گیا اس سے انسانی کردار اور انسانی فطرتوں کے متعلق بھٹو نے بہت کچھ سبق حاصل کئے۔

1 دسمبر 1967ء کو بھٹو اور اس کے سیاسی ساتھیوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنید لاہور میں ڈالی اور 21 دسمبر 1968ء کو اس نے باقاعدہ طور پر حیدرآباد سندھ میں ایوب کی آمریت کے خلاف عوام تحریک شروع کر دی۔

پارٹی بنانے کی داستان، لاہور کے اجلاس، تمام ملک میں پھیلے ہوئے اس کے رابطے اور ایوب کے ساتھ کھیلی گئی آنکھ مچولی ان سبھی میں بھٹو کی ہوشیاری، سمجھداری، سیاسی چالیں سبھی کی خاص اہمیت ہے۔ اس نے سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں اور وقت سے پیشتر خود کو ایوب کی کسی کاروائی کا شکار نہ ہونے دیا۔ چھ پوائنٹس پروگرام کے متعلق اس کا نظریہ، مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کے ایک دوسرے کے مخالف عناصر کو ساتھ رکھنا اور سرکار کے دشمنی بھرے رویئے، اخبارات پر سرکار کے قبضے اور اطلاعات کے ذرائع پر حکومت کی پابندیوں کے باجود عوام کی تائید حاصل کرنا خود ایک الگ داستان ہے۔ مخالفین کو یکجا کرنے کے لئے بھٹو کا مختلف علاقوں کا سفر، دارالخلافہ راولپنڈی میں ایک فتحیاب لیڈر کی حیثیت سے داخلہ، 3 نومبر 1968ء کو اسی طرح کے دوسرے میں فتح حاصل کرنے کے بعد لاہور پہنچنا، مقدمہ اور پھر فروری 1969ء کو جیل سے رہائی پاکستان کی قومی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ گول میز کانفرنس میں حصہ نہ لے کر بھٹو نے صرف ایوب کے خلاف جہاد ہی نہیں کیا بلکہ مخالفین کی متحدہ طاقت سے بھی لوہا لیا اور اس طرح واقعات کے اس سلسلے کی ابتدا کی جن کے آخر میں ایوب کا تختہ پلٹ دیا گیا۔

انتخابات کی مہم خود ایک بہت بڑا باب ہے۔ یحییٰ خان کی بھٹو اور مجیب کے ساتھ بے معنی بات چیت اور بھٹو کا رویہ ان سب امور کا گہرائی اور ہوشیاری سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام واقعات ابھی حال کے ہی ہیں۔ انہیں مناسب شکل میں پیش کرنے کا کام آنے والے مورخین پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بہرحال یہ باتیں خوش قسمتی سے اس کتاب کے حلقۂ موضوع سے باہر کی ہیں۔

25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں جو فوجی کاروائی ہوئی اور اس کے بعد جو واقعات ظہور میں آئے ان کے متعلق بے شمار مضامین اور کتابیں قلم بند کی جا چکی ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے بیشتر کی بنیاد مصنفین کے رنگے ہوئے ذاتی نظریہ پر ہے اور اس میں حقائق صحیح صحیح پیش نہیں کئے گئے لیکن یہ دور پاکستان کی تاریخ کا سب سے اہم دور تھا اور ذوالفقار علی بھٹو نے اس میں از حد اہم اور قابل ذکر رول ادا کیا

تھا۔طرح طرح کے لطیفے مشہور ہو گئے ہیں۔ایسے بھی لمحات ہیں جب بھٹو اور اس کے گھر والوں کے سر پر کچے دھاگے سے بندھی تلوار لٹک رہی تھی۔ایک طرف فتح کی خوشی اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس کہ قوم کے افق پر مصیبت کے بادل لہرا رہے ہیں۔پتہ نہیں وہ کب برس پڑیں۔ ایک نہیں کئی مرتبہ بھٹو اور اس کے دوست احباب ک خوفناک حادثوں کا شکار ہونے اور موت کا لقمہ بننے سے بال بال بچے ہیں۔اگر وہ ذرا سی بھی غلطی کر بیٹھتے تو ان کے سر قلم کر دئے جاتے۔بھٹو ہی کے الفاظ میں: ''ٹھیک اسی طرح جس طرح ہمارے غریب بنگالی بھائیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا گیا۔''لوگ تو بانسوں پر بندھی رسی پر چلنے کی بات کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ تیز چھری کی دھار پر چل رہے تھے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا یا یکا یک ختم ہو جائے گا اور یہ خون کی باش سے تر ہو جائیں گے۔

حالانکہ بھٹو سیاسی سٹیج پر نہیں تھے لیکن مغربی پاکستان میں ایوب کے خلاف جہاد میں تیزی آتی گئی۔مغربی پاکستانی عوام اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ اپنے لیڈر کی غیر موجودگی میں بھی وہ اپنی تحریک جاری رکھیں گے۔ابھی تک مشرقی پاکستان پر تاشقند کے اعلان یا مغربی پاکستان میں ایوب کے خلاف جاری تحریک اور مظاہروں کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔لیکن وہ بھی اکھاڑے میں کود پڑا۔وہاں دسمبر 1968ء میں یکا یک ایک منظم تحریک شروع ہو گئی۔لیکن لیڈر کی کمی اور منظم نہ ہونے کی وجہ سے تحریک پورے زوروں سے چل نہیں پائی۔

فروری تک ایوب نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کی حالت اب بہت ڈانوڈول ہو گئی ہے۔بڑی جھجک انہوں نے ریڈیو پر اعلان کیا کہ وہ 1969ء میں ہونے والے انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔انہیں امید تھی کہ اس اعلان سے عوام کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔لیکن بدبختی سے عوام پر اس کا توقع کے مطابق اثر نہیں پڑا۔تحریک جاری رہی۔قانون اور انتظامیہ کی حالت میں قطعی سدھار نہیں ہوا۔

جب صدر کی کرسی چھوڑ دینے کی چال کا کچھ اثر نہ ہوا تو ایوب نے فیصلہ کیا کہ وہ لیڈروں کا اجلاس بلائیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ حکومت میں تبدیلی کس طرح کی جائے۔اپنی نیک نیتی ظاہر کرنے کے لئے بھٹو اور مجیب کو رہا کر دیا گیا تا کہ وہ لوگ بھی اس اجلاس میں حصہ لے سکیں۔

اجلاس کی تیاری اور اپنے کام کو آسان کرنے کے لئے ایوب نے یوسف ہارون کو امریکہ سے بلانے کا فیصلہ کیا اور انہیں مغربی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔یوسف ہارون کا انتخاب قابل ذکر ہے۔ایک وقت تھا جب کہ شیخ مجیب الرحمٰن ہارون کے بیا ایجنٹ رہ چکے تھے۔پاکستان پہنچنے کے ایک ہفتے کے اندر ہی ہارون کو مشرقی پاکستان بھیجا گیا تا کہ وہ مجیب کو ایوب کیساتھ کچھ سمجھوتہ کرنے کے لئے راضی کر سکیں۔کہا جاتا ہے کہ ایوب نے مجیب کو وزیر اعظم بننے کی پیش کش کی اور یہ بھی کہا کہ وہ پارلیمانی ڈھنگ کی سرکار بنا دیں گے۔انہیں امید تھی کہ ایسی صورت میں ان کی صدر کی کرسی برقرار رہے گی۔

ذوالفقار علی بھٹو اس اجلاس کے پوری طرح سے خلاف تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اپنی کرسی قائم رکھنے کے لئے یہ ایوب کی ایک چال ہے۔اس لئے بھٹو نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اجلاس میں حصہ نہیں لے گا۔اس نے دوسرے لیڈروں سے بھی کہا کہ وہ بھی اس اجلاس میں حصہ نہ لیں۔وہ مشرقی پاکستان بھی گیا تا کہ وہ مجیب اور بھاشانی کو بھی حصہ نہ لینے کے لئے راضی کر سکے۔

بھٹو کو یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ اگرتلا مقدمے کے باوجود کے باوجود شیخ مجیب ایوب کے اور زیادہ حامی بن گئے تھے اور انہوں نے اجلاس میں حصہ لینے کا قصد لیا تھا۔یہی نہیں انہوں نے بھٹو سے اصرار کیا کہ وہ اجلاس میں ضرور حصلہ لے۔ان کی دلیل یہ تھی کہ ملک میں امن بنائے رکھنا ملک کے ہر باشندے کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔اس طرح کے بہانے وہ لوگ نہیں لیا کرتے جو کسی کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں۔تھکا ہارا اور مایوس بھٹو مغربی پاکستان لوٹ آیا۔پھر بھی اس نے اپنے دورے جاری رکھے۔اجلاس کے خلاف اس کا پروپیگنڈ

ابدستور جاری رہااور وہ لوگوں کو اس بات کے لئے راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اس اجلاس میں حصہ نہ لیں۔

24 مارچ کو بھٹو کراچی سے لاڑکانہ بذریعہ ہوائی جہاز جارہا تھا۔ وہاں اس کی چچی کا انتقال ہوگیا تھا اور اسے جنازہ میں شامل ہونا تھا۔ پتہ نہیں کس خفیہ وجہ سے اس فاکر فرینڈ شپ جہاز کو پنڈی کی جانب موڑ دیا گیا۔ جہاز میں کوئی مشینی خرابی یا موسم کی خرابی یا ایسی ہی کوئی وجہ بتائی گئی۔ جیسے ہی وہ پنڈی پہنچا جنرل یحیٰی خان نے بھٹو کو بلا لیا۔ وہ اس وقت پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف تھے۔ بھٹو یحیٰی خان سے بخوبی واقف تھا کیونکہ اس کا یحیٰی خان سے پہلے بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس لیے ان سے نہ ملنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بھٹو نے دیکھا کہ یحیٰی خان بے حد گھبرائے ہوئے ہیں اور جو حالت پیدا ہو رہی تھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ بھٹو کا یقین حاصل کرنے کے لئے یحیٰی خان نے اسے بتایا کہ ان کا خیال ہے کہ ایوب خان ناکام ہوگئے ہیں اور شاید انہیں حکومت سنبھالنی پڑے۔ بھٹو کے پاس کوئی دوسرا مشورہ نہ تھا اس لئے اس نے اپنا اتفاق ظاہر کر دیا اور کہا کہ میری صرف تین شرطیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی آزادانہ ہو۔ دوسری یہ کہ مغربی پاکستان کی ایک یونٹ ختم کر کے اسے چار صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ صوبے پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحد اور بلوچستان ہوں اور تیسری و آخری شرط یہ ہے کہ عام انتخابات کرائے جائیں جس میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو اور یہ انتخاب ایک سال کے اندر ہوں۔

ذوالفقار کی اس چال میں بہت ہی چالاکی اور ہوشیاری پنہاں تھی۔ ایک ہی تیر میں اس نے یحیٰی خان سے خارجہ پالیسی منظور کرالی۔ اسی خارجہ پالیسی کا وہ اتنے دنوں سے منتظر تھا اور اس طرح نے سرکار پر اپنا قائم کرلیا۔ یحیٰی خان سے اس نے چار صوبے بنائے جانے کی منظوری بھی لے لی تاکہ مخالف کوئی تحریک شروع کریں تو اس کے غصہ کا نشانہ یحیٰی خان بنیں نہ کہ بھٹو۔ تیسرے اس نے عام انتخابات کے لئے وقت مقرر کرالیا اور اس طرح اس نے یحیٰی خان کے ہاتھوں ہی اس کی حکومت کی ناپائیداری پر مہر ثبت کروالی۔ دوسری طرف یحیٰی خان نے محسوس کیا کہ بھٹو نے مطالبات زیادہ پیش نہیں کئے ہیں لہٰذا انہوں نے فوراً بھٹو کے سبھی مطالبات منظور کر لیے۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بھٹو یحیٰی خان سرکار میں شامل ہوگیا۔ یا وہ یحیٰی خان کا حامی بن گیا۔ اس کا رویہ دراصل یہ تھا کہ انتظار کرو اور دیکھو۔ اس وقت بھی یحیٰی خان بھٹو کو خوش رکھنے کے ارادے سے سرکاری معاملات میں مشورہ کے لئے اسے بلاتا رہتا تھا۔ یہ صلاح کاری (مشاوات) بین الاقوامی معاملات کے متعلق کی جاتی تھی۔ لیکن بھٹو اس کی شراکت اقتدار کی ہر پیش کش نامنظور کر دیتا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یحیٰی خان سرکار کو عوام کی تائید حاصل نہیں ہے اور یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ ایسی سرکار کی انتظامیہ سے خود کو وابستہ کرے۔ 10 جون 1969ء کو بھٹو نے ایک بیان میں صاف طور پر آمرانہ حکومت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس کے یہ الفاظ ایوب خان اور ان کے جاں نشین دونوں پر ہی لاگو ہوتے ہیں۔ اس وقت تو یہ الفاظ خاص طور سے ایوب خان کی طرف ہی اشارہ کر کے کہے گئے تھے۔ بھٹو نے کہا تھا:

''ایوب خان کی حکومت میں یہ تھوتھی شیخی بہت بگھاری جاتی تھی کہ ملک میں مکمل طور پر امن وامان قائم ہے اور حکومت میں پختگی اور اپیداری ہے۔ لیکن پائیداری تو اس وقت قائم ہوتی ہے۔ جب بنیادی جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اور پائیداری تو اس وقت قائم ہوتی ہے۔ جب بنیادی جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اور پائیدار جماعتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص دھمکی دے کر لوگوں کو خوفزدہ کر کے طاقت سے حاکم بن بیٹھتا ہے تو اس سے حکومت میں پائیداری نہیں آتی۔ ایک ملک جو دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو اور اس کے دونوں ٹکڑوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو اور درمیان میں ایک ایسا ملک ہو جو اس سے دشمنی رکھتا ہو تو ایسی صورت میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ملک کے دونوں حصے ایک دوسرے کو تعاون دیں اور اتحاد کی مضبوط ڈور میں بندھ جائیں۔'' اس بیان میں بھٹو نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے جائز

مظالبات کے خلاف تھا نہ انہیں نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ وہ ایوب خان، یحیٰی خان یا مغربی پاکستان کے مردفولاد کے خیالات سے بھی متفق نہیں تھا جو مشرقی پاکستان کے بھائیوں کو ہمیشہ دوسرے درجے کا شہری بنائے رکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بھٹو کی رائے تھی اور یہی اس کی پارٹی کی بھی رائے تھی کہ مشرقی پاکستان کا مسلسل خون چوسا گیا ہے اس لئے جو بھی مسئلے ہیں ان کا سیاسی حل نکالا جانا چاہیے۔

اس وقت بھی جب وہ ایوب سرکار میں وزیر خارجہ تھا اس نے صدر ایوب سے اصرار کیا تھا کہ وہ شیخ مجیب کو سیاسی سمجھوتے کے لئے مجبور کریں انہیں گرفتار کر کے جیل میں نہ ڈالیں۔

دراصل خود بھٹو کو بھی مشرقی پاکستان میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ وزیر خارجہ کا عہدہ چھوڑنے کے فوراً بعد بھٹو نے ڈھاکہ کا دورہ کیا تھا جہاں جب وہ ایک کرکٹ ٹیسٹ میچ دیکھنے کے لئے کھچا کھچ بھرے اسٹیڈیم میں پہنچا تو لوگوں نے کھڑے ہو کر نعروں اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کا پرجوش استقبال کیا تھا۔

یحیٰی خان نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مغربی پاکستان کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فوج کس طرح غیر فوجی سرکار کو حکومت کی اگ ڈور سونپے گی۔ اس سرکلر میں نہ صرف انتخابات کا ذکر کیا گیا تھا بلکہ ان رہنما اصولوں کی بھی ہدایت دی گئی تھیں جن کی بناء پر آئین بنانا جاتا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا انتخابات کی مہم سال بھر تک جاری رہے گی۔ جس کی بعد اسمبلی کی بیٹھک ہوگی اور 120 دن کے اندر آئین مکمل کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر صدر کی خواہش ہوگی تو وہ ''ویٹو'' استعمال کر سکیں گے۔

جنوری 1970ء میں انتخابات کی مہم کی ابتدا ہوگئی۔ چودہ سال کی آمرانہ حکومت میں یہ پہلا انتخاب تھا۔ بالغ ووٹوں کی بناء پر پاکستان میں یہ پہلا انتخاب تھا۔ ایسا انتخاب چوبیس سالوں میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ انتخاب کی مہم کے دوران سبھی پارٹیاں کھل کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں۔ بے شمار امیدوار انتخاب میں کھڑے ہوئے انہوں نے اپنی قسمت آزمائی۔ ملک میں اس سے پہلے آزاد اور غیر جانب اور انتخاب کبھی نہیں ہوئے تھے۔

اپریل 1970ء میں صدر یحیٰی خان کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ بہت سے مشہور عزت دار بڑے بڑے مہمان جن میں ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھا۔ پاکستان کے مختلف حصوں سے بلائے گئے تھے۔ کافی شور شرابہ اور ہنگامہ تھا۔ خوشی کے اس موقع پر یحیٰی خان نے بڑے حجر سے کہا کہ اس نے جو بھی وعدے کئے تھے پورے کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے بھٹو کی جانب مڑ کر کہا: ''چونکہ میں نے اپنے وعدے پورے کر دیئے ہیں اس لئے اب حکومت آپ لوگوں کو سنبھال لینی چاہیے۔'' جواب میں بھٹو نے یحیٰی خان کو یاد دلایا کہ وہ زیادہ خوش نہ ہوں۔ ابھی بے شمار دشواریاں سامنے ہیں۔ ایک سال سے امیدواروں کے درمیان جو جدوجہد جاری ہے اس میں بہت سے لوگ انتخاب میں ہار جائیں گے اور چھوٹے چھوٹے امیدواروں کو بڑے امیدوار ہڑپ کر لیں گے۔ اس طرح کے انتخاب کی مہم کے بعد جو بھی نمائندے منتخب ہو کر آئیں گے وہ آپس مُس لڑنے جھگڑنے کے سوائے اور کچھ نہیں کریں گے۔ ایسے لوگ کسی بات پر متفق نہیں ہوں گے اور 120 دن کے اندر آئین تیار نہیں ہو جائے گا۔ اس وجہ سے جنرل یحیٰی خان کو دوبارہ یہ اعلان کرنا ہوگا کہ لیڈران کامیاب نہیں ہو پائے اور ایک مرتبہ ان سے پھر کہا گیا ہے کہ وہ یعنی یحیٰی خان ملک کی رہنمائی کریں۔

بھٹو نے یحیٰی خنا کو متنبہ کیا کہ اگر ایسا ہوا تو زبردست خون خرابہ ہوگا اور مرتبہ فوج بھی اچھوتی نہ رہ سکے گی۔ بھٹو کی بات سن کر یحیٰی خان ایک دم ہراساں ہو گئے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ وہ دونوں مل کر آگے کی بات چیت ذاتی طور پر تنہائی میں کریں گے۔ یہاں سب کی موجودگی میں اس طرح کی باتیں کرنا مناسب نہیں ہے۔

جب دونوں لیڈروں کی ملاقات تنہائی میں ہوئی تو ذوالفقار علی نے اپنے شکوک تفصیل کے ساتھ یحییٰ خان کو بتائے اور یہ بھی اشارہ کیا کہ اسے کیا کیا خطرے نظر آرہے ہیں۔ بھٹو نے مارچ 1969ء کی ایک میٹنگ کی بھی یاد دلائی۔ جس کا خاص مدعا صوبوں کی خودمختاری تھی اور کہا کہ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ سبھی لیڈروں کو بلا کر بات چیت کی جائے اور وہ جو بھی چاہیں وہ سب کرنے کا وعدہ کرلیا جائے۔ شرط یہی رہے گی کہ وہ صوبائی خودمختیاری کے مناسب پروگرام کے متعلق متفق ہوجائیں۔

اس گفتگو کے بعد بھٹو کو ایسا محسوس ہوا کہ حکومت چھوڑنے کا یحییٰ خان کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آئینی ڈھانچے کے متعلق جو حکم نامہ جاری کیا گیا ہے وہ اس طرح کا ہے جس سے کہ ایسی حالت پیدا ہوجائے جس سے یحییٰ خان کے ہاتھ میں ہی حکومت بنی رہے۔ بھٹو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ تمام ڈرامہ بے کار کی بکواس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

یحییٰ حکومت نے بار بار اعلان کیا تھا کہ وہ 1970ء کے انتخابات کی مہم کے دوران علیحدہ رہے گی اور کسی کی بھی طرف داری نہ کرے گی۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی اور سرکار کے کئی وزیروں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف کھل کر اپنے عہدے کا استعمال کیا۔ اس مین تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ ان کے لیڈر کا رخ کیا ہے۔ جنرل یحییٰ خان نے اپنی شرافت اور نیک نیتی ظاہر کرنے کے لئے خود کو ''ریفری'' بتایا۔ بھٹو نے جب انتخابات کی مہم کی ابتدا کی تو پہلے عام جسلے میں نہایت طنزیہ الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ یحییٰ خان ایسے ریفری ہیں جو موقعہ پانے پر کسی بھی ٹیم گول کرسکتے ہیں۔ ایوب کے دور حکومت میں بھٹو کو جن تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، وہی تکلیفیں اسے ایوب کے جان نشین کے زمانے میں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن یہ تکلیفیں اس قدر نمایاں نہیں تھیں۔

سرکار نے تقریباً اپنی تمام طاقت پیپلز پارٹی کے خلاف لگادی اور یکم جنوری 1970ء کو یحییٰ خان نے اپنے بھائی آغا محمد علی کو نیشنل سیکورٹی کونسل کا صدر بنادیا۔ انہوں نے اپنے بھائی کو حکم دیا کہ وہ بھٹو کی پارٹی کی رفتار کو ختم کرنے کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو وہ کریں۔

دراصل ریفری کے اس ایجنٹ نے بے حد تشدد پیدا کرنے والے طریقے استعمال کئے اور اس کے کام کرنے کا طریقہ کم از کم ''ایمپائر'' جیسا تو قطعی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان کے انتخاب کے لئے روپیہ جمع کرنا شروع کردیا اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حیثیت سے مغربی پاکستان میں روپیہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ پولیس نے اس موقعے پر بھٹو کو پریشان کرنے کے لئے جو کچھ بھی بن پڑا کیا۔ بھٹو ہی نہیں اس کی پارٹی کے دیگر ممبر اب بھی پولیس کی زیادتیوں کے شکار ہوئے۔ پیپلز پارٹی جو بھ شکایات پیش کرتی ان کو نظر انداز کردیا جاتا اور کوئی کاروائی نہ کی جاتی۔

31 مارچ 1970ء کو جب بھٹو کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تو بہت ہی نازک گھڑی آگئی۔ سرکار نے اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور چند ملزمان کے خلاف نام نہاد کاروائی کی۔ تفتیش کے مطالبہ کو اس نے منظور نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یحییٰ خان بھٹو کو بہت ہی ناپسند کرنے لگے تھے اور یہ ناپسندی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ انہوں نے ایک موقعے پر کھلے عام یہ اعلان کیا کہ بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایسے مخالف ماحول میں اس کی سرکار کے کچھ لوگ کھلے عام یہ کہتے ہوئے دیکھے گئے کہ وہ بھٹو کی بوٹی بوٹی نچوا کر کتوں کو ڈلوادینگے۔

ان پریشانیوں کے باوجود اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ صدر کے احکام کے تحت جو بھی ذرائع دستیاب ہوں انہیں کی مدد سے کام جاری رکھا جائے۔ اس میٹنگ کے بعد یحییٰ خان نے ظاہری اور پوشیدہ طور سے ذوالفقار علی بھٹو اور اس کی پارٹی کے ممبران کو ہر طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کی۔

چودھواں باب

مصیبت کی سمت

اب ذوالفقار علی بھٹو کو یہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ یحییٰ خان کا آئین کے متعلق حکم عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔ جب تک کہ مختلف لیڈروں میں لیڈروں میں پہلے سے ہی سمجھوتہ نہ ہو جائے، تب تک مقررہ وقت کے اندر آئین کا تیار ہونا ممکن نہیں تھا۔ جب تک نیشنل اسمبلی کا اجلاس ہونے سے پہلے ہی لیڈروں میں آپس میں کچھ فیصلہ نہیں ہو جاتا تب تک شیخ مجیب کے چھ پوائنٹس پروگرام کو لے کر کام میں رکاوٹ آنے کا اندیشہ بنا ہوا تھا۔ اگر اکثریت سے آئین کو بنانے کا طریقہ طے ہوتا تو شیخ مجیب کو کامیابی حاصل ہو جاتی اور درحقیقت وچھ پوائنٹس کی بناء پر آئین تیار کر سکتے تھے۔ جب یہ باتیں یحییٰ خان کے سامنے آئیں تو اس نے بھٹو کو بتایا کہ میں شیخ مجیب سے بات چیت کر چکا ہوں اور انتخابات ختم ہو جانے کے بعد شیخ مجیب چھ پوائنٹس پروگرام لاگو کئے جانے کی ضد نہ کریں گے۔

انتخاب ہوئے جن کے نتائج سے سبھی آشنا ہیں۔ شیخ مجیب کو مشرقی بنگال میں زبردست اکثریت کے ساتھ فتح ہوئی۔ بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان میں فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کا موقعہ ملا۔ یحییٰ خان نے دونوں جیتے ہوئے لیڈروں کو بذریعہ تار مبارک باد دی۔ بھٹو نے اس مبارک باد کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جس وقت تک یحییٰ خان کے ماتحتوں نے جا کر بھٹو سے ملاقات نہیں کی اور اس سے یہ نہیں کہا کہ صدر اپنے مبارک باد کے تار کے جواب کی امید رکھتے ہیں۔

جنوری 1971ء میں یحییٰ خان مجیب سے ملاقات کرنے مشرقی پاکستان گئے۔ ملاقات کے بعد یحییٰ خان نے مجیب کی موجودگی میں اخبار کے نمائندوں کو بتایا کہ ہم دونوں بات چیت کے نتائج سے مطمئن اور خوش ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں نے ابھی ابھی پاکستان کے ہونے والے وزیراعظم سے بات چیت کی ہے۔

اس کے بعد یحییٰ خان نے مغربی پاکستان واپس چلے گئے۔ انہوں نے لاڑکانہ جا کر بھٹو سے ملاقات کرنے کا اصرار کیا۔ یہ ملاقات نہایت دوستانہ ملاقات رہی۔ یحییٰ خان نے شہد جیسی شیریں باتیں کیں اور بھٹو سے کہا کہ وہ گزری ہوئی باتوں کو بھلا دے اور مستقبل میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ بھٹو نے کہا، یہ سب بات تو درست ہے لیکن چھ پوائنٹس پروگرام کا کیا ہوا؟ یحییٰ خان نے کہا کہ اس پروگرام میں غلط بات کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ مجیب نے یحییٰ خان کو چھ پوائنٹس پروگرام تسلیم کر لینے پر رضامند کر لیا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے یحییٰ خان کو صاف صاف بتا دیا کہ اگر مجیب اپنے چھ پوائنٹس پروگرام کے کسی حصے کو پورا کرنے کے لئے زور نہیں دیتے یا چھوڑ دیتے ہیں تو یہ بات اسے معلوم ہونی چاہیے اور اس کے متفق ہو جانے پر ہونی چاہئے۔ یہ ایک مسئلہ ہے جو صرف اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ مجیب کو پاکستان کے اتحاد کی حفاظت کے لئے کچھ اور باتیں تسلیم کر لینے کے لئے رضامند کیا جائے۔ زلفی نے یحییٰ خان کو یہ بھی بتایا کہ اگر ایک صوبے کو خودمختاری دی جائے گی تو یقیناً چاروں صوبوں کو بھی دینی پڑے گی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پانچ ایسی ریاستیں قائم ہو جائیں گی جن کے پاس ادھوری آزادی ہوگی۔ یا کم از کم مشرق اور مغرب میں دو صوبے تو ایسے ضرور ہی بن جائیں گے۔ پھر ہر صوبے کے حقوق یکساں ہوں گے۔ اگر یہ طریقہ عمل میں لایا گیا تو پاکستان پانچ خودمختار صوبوں کا مجموعی ملک نہ رہ کر پانچ ادھوری آزاد ریاستوں کا ملک بن جائے گا۔

بھٹو کی دلیل پر یحییٰ خان کا تاثر عجیب طریقہ کا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میں تو سپاہی ہوں اور وفاقی ریاست کا فرق میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو صرف ملک کے اتحاد کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں اگر آپ کوئی تبدیلی چاہتے ہیں تو سیدھے مجیب سے بات کیجیے۔

اس لئے 27 جنوری 1971ء کو بھٹو مشرقی پاکستان میں مجیب سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔ ادھر مجیب کا رویہ تبدیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھٹو سے کہہ دیا کہ میں آپ سے اس وقت تک بات چیت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جب تک آپ چھ پوائنٹس پروگرام کو تسلیم نہیں کر لیتے۔ بھٹو نے یاد دلایا کہ آپ یحییٰ خان سے سمجھوتہ کر چکے ہیں اور اس کے مطابق یہ طے ہو گیا ہے کہ آپ اس پروگرام پر اڑے نہیں رہیں گے۔ اس پر مجیب نے جو جواب دیا اس کے یہ معنی ہوتے تھے کہ وہ تو میں نے ایک فوجی آمر کو بے وقوف بنایا تھا۔ ایک وقت تھا جب چھے نکات کو اس کی تخلیق مانا جاتا تھا لیکن اب وہ بنگالی عوام کی آواز بن گیا ہے۔

مجیب نے اور مطالبات پیش کر کے مسئلے کو زیادہ الجھا دیا۔ بھٹو نے ''دی گریٹ ٹریجڈی'' میں لکھا ہے: ''اس طرح مغربی پاکستان کے ذمہ 40 ارب روپوں میں سے 38 ارب روپے کا باہری ملکوں کا قرض اور 31 ارب روپے کا گھریلو قرض چڑھ گیا۔ عوامی لیگ کے شمار کے مطابق مغربی پاکستان کے چار صوبوں کو ملک کی تقریباً 74 فیصد ضروریات پوری کرنا پڑتیں اور مشرقی پاکستان کا حصہ صرف 26 فیصد ہی رہتا۔ اس طرح اس بات پر قطعی غور نہیں کیا گیا کہ پاکستان میں مشرقی بنگال کی آبادی 56 فیصدی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچا گیا تھا کہ مغربی پاکستان سے جو رقم ہر جانے کی صورت میں مشرقی پاکستان کو آئندہ کئی سالوں تک مرکزی حکومت کا پورا مالی بوجھ برداشت کرنا پڑتا اور گذشتہ 24 سالوں میں مالی ذمہ داریوں اور قرضہ کی ادائیگی وغیرہ کے جو عدے کئے گئے تھے ان میں سے زیادہ تر مغربی پاکستان کو ہی پورے کرنے پڑتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مغربی پاکستان میں ترقی کے تمام کام رک جاتے اور مشرقی پاکستان کو اپنی منصوبہ بندی جاری رکھنے میں امداد حاصل ہو جاتی۔ یہ مطالبات مغربی پاکستان کی آئینی ذمہ داریاں بن جاتے۔''

بھٹو اور اس کی پارٹی ایسی حالت میں نہیں تھی کہ ان مطالبات کو تسلیم کر لیتی۔ ایسی کوئی بات ہونی چاہئے تھی جسے مغربی پاکستان منظور کر سکتا یا کم از کم مغربی پاکستان کے منتخب نمائندے اسے منظور کر سکتے۔

جہاں تک چھے پوائنٹس پروگرام کا سوال ہے تو بھٹو نے مجیب کو بتایا کہ میں اسے جو کا توں تسلیم نہیں کر سکتا لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس کے زیادہ سے زیادہ حصے مغربی پاکستان کے لوگ تسلیم کر لیں۔ اس کام کے لیے وقت درکار ہے۔ اس لئے اس نے مشورہ دیا کہ 15 فروری 1971ء کو نیشنل اسمبلی کی جو میٹنگ ہو رہی ہے۔ اسے چند ہفتوں کے لئے ملتوں کر دیا جائے جس سے وہ یہ معلوم کر سکے کہ مغربی پاکستان کو شیخ مجیب کا چھ پوائنٹس پروگرام کس حد تک منظور ہے۔

شیخ مجیب نے نیشنل اسمبلی کا ملتوی کیا جانا منظور نہیں کیا یونکہ مجیب نے جنگ کی جو پالیسی اختیار کی تھی یہ بات اس کے مطابق نہ تھی۔ پالیسی یہ تھی کہ نیشنل اسمبلی میں اکثریت کی طاقت پر چھ پوائنٹس پروگرام کو منظور کرا لیا جائے اور اس کی بناء پر آئین تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کر دیا جائے یہ آئین ایک حقیقت ہوتا اور پھر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بھٹو نے شیخ مجیب سے اصرار کیا کہ یا تو وہ چھے پوائنٹس پروگرام کے متعلق کوئی سمجھوتہ کر لیں یا آئینی ڈھانچے کے متعلق جاری کئے گئے سرکلر کے مطابق آئین بنانے کیلئے 120 دن کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے اسے ہٹا دیں۔ اگر ان میں سے کوئی بات نہ ہو سکے تو نیشنل اسمبلی کی میٹنگ چند ہفتے بعد یعنی 23 مارچ 1971ء کو ہوتا کہ اسے بات چیت کے لئے وقت مل جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بات نہ کی گئی تو اسمبلی کو بنائے رکھنا مشکل ہوگا۔

لیکن بھٹو نے محسوس کیا کہ شیخ مجیب نے اپنے دماغ کے دروازے بند کر لئے ہیں اور وہ کوئی بھی مناسب اور جائز دلیل سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بہر حال بھٹو مغربی پاکستان واپس چلا گیا اور اس نے چھ پوائنٹس پروگرام کے ایک ایک پوائنٹ کے حق میں دلائل پیش کر کے

پورے پروگرام کے ساڑھے چار یا پانچ پوائنٹ مغربی پاکستانیوں سے منظور کرالینے میں کامیاب ہوگیا۔ دراصل اور تو سبھی باتیں مغربی پاکستانیوں نے منظور کرلیں لیکن وہ کرنسی تجارت اور امداد کے معاملے میں رضامند نہیں ہوئے۔

تقریباً پانچ پوائنٹ منظور کرالینے کے بعد بھٹو نے شیخ مجیب سے کہا کہ مجھے کچھ وقت اور دو تا کہ مکمل طور پر سمجھوتہ ہو سکے۔ یکا یک یحییٰ خان سوتے سوتے جاگ پڑے اور انہیں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ سمجھوتہ کہیں واقعی ہو ہی نہ جائے اور انہوں نے اسمبلی کی بیٹھک غیر مقرر وقت تک کے لئے ملتوی کئے جانے کا اعلان کر دیا۔ یہ بیٹھک 2 یا 3 مارچ کو ہونے والی تھی۔ یحییٰ خان نے اپنے اس اعلان میں یہ نہیں بتایا کہ اسمبلی کی بیٹھک اب کس تاریخ کو ہوگی۔

جب بھٹو نے سنا کہ یحییٰ خان نے اسمبلی کی بیٹھک غیر مقررہ وقت کے لئے ملتوی کر دی ہے تو اس نے محسوس کیا کہ اب جھگڑا ہوگا۔ اس نے یحییٰ خان کو اس بات کے لئے جھڑکا کہ اس نے اسمبلی کی بیٹھک ملتوی کر دی تو بھٹو اعتراض کر رہا ہے۔ بہرحال یحییٰ خان نے آئندہ بیٹھک کی تاریخ طے کرنے سے انکار کر دیا اور یحییٰ خان کو اجلاس رد کر دینا پڑا۔

اسمبلی کا ملتوی کیا جانا بہت مہنگا پڑا۔ جیسے ہی یہ اطلاع مشرقی پاکستان کے لوگوں تک پہنچی وہاں غدر مچ گئی۔ مجیب نے مشرقی پاکستان کی تقریباً تمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور وہ سب کو احکام جاری کرنے لگے۔ ہر جگہ ان کے حکم کے مطابق کام ہونے لگا۔ ان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی شامل تھے۔ دراصل مشرقی پاکستان کی پوری حکومت ان کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ لیکن قانون کی رو سے انہیں ایسا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ قانون اور انتظامیہ کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔

آخر 17 مارچ 1971ء کو یحییٰ خان ڈھاکہ گئے۔ انہوں نے بھٹو سے اصرار کیا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ چلے۔ لیکن بھٹو نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس وقت تک ڈھاکہ نہیں جائے گا۔ جب تک مجیب اس سے بات چیت کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں گے۔ ڈھاکہ پہنچ کر دو روز بعد یحییٰ خان نے بھٹو کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ مجیب اس سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ 20 مارچ کو بھٹو ڈھاکہ پہنچا اور اس نے یحییٰ خان کی موجودگی میں مجیب کے ساتھ بات چیت کی۔ بات چیت شروع نہیں ہوئی تھی کہ شیخ مجیب نے کہا کہ وہ بھٹو سے بات چیت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یحییٰ خان ان کی اسکیم کے متعلق بھٹو کو بتا سکتے ہیں۔ یہ سن کر بھٹو کمرے سے اٹھ کر باہر جانے لگا۔ تب مجیب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ''بھائی مجھے بچاؤ۔'' اور پھر انہوں نے سمجھوتے کے لئے اپنی تجاویز دینے شروع کر دیں۔

بھٹو نے کہا: ''ہم لوگ یہاں بات نہیں کرتے۔ چلئے ہم لوگ باغ میں چلیں'' وہ دونوں باغ میں جا کر ٹہلنے لگے۔ مجیب نے بھٹو سے کہا کہ وہ مغربی پاکستان کا وزیراعظم بن جائے اور انہیں مشرقی پاکستان کا وزیراعظم بن جانے دے۔ اس کے ساتھ ہی مجیب نے بھٹو کو متنبہ کیا کہ وہ فوج کا یقین نہ کرے۔ وہ ہم دونوں کو ختم کر دے گی۔ اس پر بھٹو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: ''میں تاریخ کے ہاتھوں مرنے کے بجائے فوج کے ہاتھوں مرنا زیادہ پسند کروں گا۔''

روانگی سے پیشتر شیخ مجیب نے خواہش ظاہر کی کہ ان دونوں کی رات کو پھر ملاقات ہو۔ اس پر زلفی نے جواب دیا کہ میں مشرقی پاکستان چوروں کی طرح چھپ چھپ کر ملنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ پھر بھی اس نے وعدہ کر لیا کہ اگر ضروری ہوا تو شیخ مجیب کے پاس اپنا کوئی بھروسے کا آدمی بھیج دے گا۔

یحییٰ خان اپنے کمرے کے پردوں کے پیچھے کھڑا بھٹو اور مجیب کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے فوجی سیکرٹری کے ذریعے بھٹو کو اطلاع پہنچائی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ بھٹو کے کمرے میں پہنچتے ہی یحییٰ خان نے جلدی سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟ ہنی مون؟'' ذوالفقار علی نے

جواب دیا کہ شیخ مجیب نے اپنی یہ اسکیم بتائی ہے کہ نیشنل اسمبلی کی دو کمیٹیاں ہوں ایک مشرقی پاکستان کیلئے اور دوسری مغربی پاکستان کے لئے۔ اس کے بعد نیشنل اسمبلی کی بیٹھک کی جاسکتی تھی اور اس کے سامنے ریزولیشن صحیح طور پر رکھے جاسکتے ہیں۔

اس وقت تک عوامی لیگ نے اپنے اصلی ریزولیشن تبدیل کر دیئے تھے اور اب وہ اجلاسوں کے حق میں تھی۔ دو کمیٹیوں کے بجائے دو اجلاس چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ دو اجلاس ہوں اور وہ دو آئین تیار کریں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دو کمیٹیاں اپنی رپورٹ تیار کریں جن میں ریزولیشن ہوں اور پھر ان رپورٹوں کو نیشنل اسمبلی میں پیش کیا جائے اور پھر بعد میں پاکستان کو کنفیڈریشن اور دو آئین جوڑ کر ایک میں باندھنے کے لئے نیشنل اسمبلی کی بیٹھک بلائی جائے۔ عوامی لیگ نے پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر پاکستان کو کنفیڈریشن بنائے جانے کی پیشکش کی۔

پریشان ہو کر ذوالفقار نے یہ پیشکش اس شرط پر منظور کر لی کہ نیشنل اسمبلی شروع میں ہی ان تجاویز کو منظور کر لے ورنہ ایک خلا پیدا ہو جائے گا۔ 23 مارچ کو شیخ مجیب نے بھٹو کی یہ شرط نامنظور کر دی۔

24 مارچ کو بھٹو یحییٰ خان سے ملاقات کرنے کے لئے گیا اور اسے فوراً شک ہو گیا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ کیونکہ یحییٰ خان نے بھٹو کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بھٹو کو ایسا محسوس ہوا کہ یحییٰ خان نے فوجی کاروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

بھٹو نے اپنا یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے یحییٰ خان کو مشورہ دیا کہ وہ اس طرح کا کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ وقت کافی گزر چکا ہے اور اب یہ مناسب نہیں ہے کہ طاقت کے ذریعے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ یحییٰ خان کے پاس اتنا ساز و سامان نہیں ہے کہ فوجی طاقت سے مسئلے کو حل کر سکے۔ یحییٰ خان نے کہا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا اور کل بتاؤں گا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جائے۔ دوسرے دن 25 مارچ 1971ء کی تاریخ تھی۔

دو پورے دن بھٹو یحییٰ خان کے پیغام کا انتظار کرتا رہا اور جب یحییٰ خان کی طرف سے شام ہو جانے تک بھی کوئی خبر موصول نہ ہوئی تو بھٹو نے پنجاب کے گورنر کو مجیب سے ملنے کے لئے بھجا تا کہ پتہ لگایا جاسکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجیب نے غیر یقینی انداز میں گورنر سے پوچھا: ''کیا آپ کو پتہ نہیں کہ یحییٰ خان مغربی پاکستان روانہ ہو چکے ہیں۔؟''

جب بھٹو نے یہ سنا تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا۔ اس نے فوراً پریزیڈنٹ ہاؤس سے رابطہ قائم کیا۔ جہاں سے اسے پتہ چلا کہ یحییٰ خان ایسٹرن کمانڈ میس میں ڈنر پر گئے ہیں۔ بھٹو نے میس میں ٹیلی فون کیا تو اسے بتایا گیا کہ صدر ڈنر پارٹی میں ہیں اور اس وقت ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بھٹو خان گیا کہ شیخ مجیب کو غلط اطلاع دی گئی ہے۔

25 مارچ 1971ء کی رات کو 11 بجے فوجی کاروائی شروع ہو گئی۔ بھٹو بعد میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر یحییٰ خان کو فوجی کاروائی شروع کرنی ہی تھی تو اسے مشرقی پاکستان میں کیوں چھوڑ دیا گیا افی سوچ بچار کے بعد بھٹو اسی نتیجے پر پہنچا کہ ایسا جان بوجھ کر کیا گیا کہ بھٹو فوجی طاقت اور اس کی حملہ کرنے قوت کو دیکھ سکے۔ ڈھاکہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں رہتے ہوئے بھٹو نے دور سے یہ دیکھا کہ فوج نے حملہ کس طرح شروع کیا۔

اگلے دن ہی بھٹو مغربی پاکستان روانہ ہو گیا۔ اسی جہاز میں جنرل محمد عمر بھی تھے۔ لیکن جنرل کا برتاؤ گذشتہ دو دنوں کی نسبت کہیں مختلف تھا۔ بھٹو کے ایک ساتھی نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور بھٹو کو توجہ دلائی۔

27 مارچ 1971ء کو مغربی پاکستان واپس آنے کے بعد بھٹو نے جنرل پیرزادہ کو متنبہ کیا کہ اگر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ فوج شیخ مجیب الرحمٰن کو کچل سکتی ہے اور یہی حال پاکستان میں بھی کر سکتی ہے تو انہیں سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ کسی مسئلہ کو حل کرنے کا یہ فوجی طریقہ نہایت

احمقانہ طریقہ ہے۔ پیرزادہ نے یہ تھوتھا بہانہ پیش کیا کہ بھٹو کو معلوم نہیں کہ صدر نے شیخ مجیب کو منانے کی کس قدر کوشش کی اور انہیں اپنی رائے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنے کے لئے کس قدر زور دیا۔

ادھر مشرقی بنگال میں فوج کو بے لگام کر دینے کے بعد یحییٰ خان نے بھٹو اور اس کی پارٹی کو تنگ کرنے کا ہر طریقہ آزمانا شروع کر دیا۔

اس کے بعد یحییٰ خان نے زلفی سے بول چال بند کر دی اور بھٹو کو اس سے ملنے کا کوئی موقعہ نہیں ملا۔ آخر اپریل 1971 میں جب بھٹو کی یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تو یحییٰ خان نے اس سے کہا کہ علیحدگی چاہنے والوں کی کمر توڑ دی گئی ہے۔ اور اب اسے مشرقی پاکستان سے خوفزدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ بھٹو نے کہا کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حالات بے قابو ہو جانے کی ذمہ داری صدر پر ہی ہے۔ چھاپا مار مشرقی بنگالیوں کے دلوں میں نفرت بھر گئی ہے اور مہاجرین کی وجہ سے مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جلد ہی پارش شروع ہو جائے گی اور فوج کے لئے کوئی کاروائی کرپانا دشوار ہو جائے گا۔ اس کے چھاپا مار پورا فائدہ اٹھائیں گے اور ان کے دلوں میں بھری ہوئی نفرت کی وجہ سے سمجھوتہ کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

بھٹو نے دیکھا کہ یحییٰ خان کو اس بات کی ذرا بھی فکر نہیں۔ اس نے زلفی سے کہا کہ یہ فوجی معاملے ہیں جن کے متعلق اسے رتی بھری بھی علم نہیں ہے۔ دوست کی حیثیت سے انہوں نے بھٹو کو تاکید کی کہ اس کا رویہ ٹھیک رہنا چاہیے۔ وہ تشدد پیدا کرنے والی تقریروں کو ہرگز برداشت نہ کرے گا۔ اگر بھٹو نے اس کی تاکید پر عمل نہ کیا تو اس کے ساتھ بھی مجیب جیسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

یہ سن کر بھٹو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا کہ ''میں یہاں آپ کی دھمکیاں سننے کے لیے نہیں آیا ہوں'' جنرل پیرزادہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے گئے اور بھٹو کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

بہت جلد فوج میں بھٹو کے خلاف تقریریں شروع ہو گئیں تاکہ نوجوان افسروں کے دلوں میں سے بھٹو کے لئے جو عزت تھی نکالی جا سکے۔ یہ نوجوان افسر بھٹو کے حامی تھے دوسری طرف مشرقی بنگال میں بارش شروع ہو گئی اور جیسی بھٹو نے پیشین گوئی کی تھی حالت بدتر ہو گئی۔

بین الاقوامی حلقے میں سوویت روس نے اس معاملے میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ یحییٰ خان اور سوویت لیڈروں کے درمیان کچھ خط و کتابت ہوئی۔ آخر میں جب مشرقی پاکستان میں فوج کو ہر قدم پر شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو یحییٰ خان نے دیکھا کہ اب وہ چاروں طرف سے گھر چکا ہے۔ اس نے بھٹو سے اصرار کیا کہ وہ کوئی حل تلاش کرے۔ بھٹو نے جواب دیا کہ وہ حکومت غیر فوجی سرکار کو سونپ دے اور یہ غیر فوجی سرکار ہی شیخ مجیب سے بات چیت کرے۔ چند دن بعد یحییٰ خان نے بھٹو کو پھر بلایا۔ بھٹو نے اسے پھر یہی مشورہ دیا کہ وہ غیر فوجی سرکار کے ہاتھوں میں حکومت سونپ دے۔ اس پر دیا سلائی کی ایک ڈبیہ اٹھا کر بھٹو کی سمت بڑھاتے ہوئے یحییٰ خان نے پوچھا کہ ''کیا حکومت سونپ دینا اتنا ہی آسان ہے؟'' بھٹو نے دیا سلائی کو ڈبیہ اٹھالی اور اسے یحییٰ خان کو واپس دیتے ہوئے کہا: ''ہاں یہ اتنا ہی آسان ہے''۔

مشورہ یہ دیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں 10 یا 15، ایماندار لوگوں کی ایک نگران حکومت بنا دی جائے۔ اس مشورہ کے مطابق یحییٰ خان نے ایم۔ اے ملک کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ اس کے بعد میٹروپول ہوٹل کے باہر ایک عام جلسے میں یحییٰ خان نے ایک جوشیلی تقریر کی۔ جس میں اس نے کہا کہ ''اگر ہندوستان جنگ چاہتا ہے تو جنگ کر کے دیکھ لے۔'' بھٹو نے اس تقریر کی تردید کی۔ یحییٰ خان جھنجھلا پڑے اور بھٹو سے پوچھنے لگے کہ ''تم نے میری تقریر کی تردید کیوں کی؟'' بھٹو نے جواب دیا: ''کیونکہ آپ جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ خاصطور سے ایسی فوج کے ساتھ جو 14 برسوں سے سیاست میں الجھی ہو۔''

پندرھواں باب

کون ذمہ دار تھا؟

میں نے پچھلے ہر باب میں حقائق بیان کرنے کا غیر جانبدارانہ انداز جان بوجھ کر اختیار کیا تھا۔ کیونکہ کئی حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں مصیبت پیدا کرنے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ہی سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ اسی نے جنرل یحیٰی خان کو فوجی کارروائی کرنے پر اکسایا تھا۔ تاکہ وہ خود وزیر اعظم بن سکے اور اسے شیخ مجیب کی ماتحتی میں کام نہ کرنا پڑے۔ اگر پچھلی باتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ بھٹو کے خلاف یہ الزام صحیح ہے تو ضرور ہی اس کے پاس یہ یقین کرنے کی معقول وجوہات ہوں گی۔ چند لوگ یہ ضرور محسوس کریں گے کہ زلفی ان واقعات کو روکنے کے لئے کوئی ترکیب استعمال کر سکتا تھا جن کی وجہ سے پاکستان کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا اور بنگلا دیش بنا۔ لیکن اس طرح کا نتیجہ نکالنا بھی ایسی حالت میں ممکن نہیں ہے جب کوئی یہ جانتا ہو کہ بچپن سے ذوالفقار علی بھٹو کن باتوں سے متاثر ہو کر کام کرتا رہا ہے اور خاص طور سے خطروں سے بھرے گذشتہ تین برسوں میں وہ کن باتوں سے اثر قبول کرتا رہا ہے۔

بھٹو دو نیشن کی تھیوری میں بہت زیادہ کٹر پن سے یقین کرتا رہا ہے اور ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہے کہ پاکستان کو طاقتور ملک بنانا چاہیے۔ اس کی خارجہ پالیسی آزاد ہونی چاہیے۔ اور داخلی معاملوں میں پاکستان کو ترقی پسند مالی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ وہ ایسا پہلا لیڈر تھا جس نے یہ محسوس کیا اور بتایا کہ پاکستان کے مشرقی علاقے کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کے ساتھ مالیت کے سلسلے میں منصفانہ اور مناسب برتاؤ کا سب سے زیادہ حامی رہا ہے۔ اس نے پاکستان کو متحدہ رکھنے کی خواہش کبھی نہیں چھوڑی خواہ اس کے لئے اسے ذاتی طور پر یا اس کے ملک کو جو بھی قربانی دینی پڑی ہو۔

بھٹو اور مجیب کے درمیان اختلاف چھ پوائنٹس پروگرام کی تشریح سے شروع ہوا۔ بھٹو کا خیال تھا کہ اس سے پاکستان میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ اسے یہ بھی شک تھا کہ کیا یہ فارمولہ واقعی مجیب کی مرضی کے مطابق بنایا گیا ہے۔ آنے والی پیڑھیوں کے مورخین برسوں تک میں اس سلسلے پر بحث مباحثہ کرتے رہیں گے کہ اگر بھٹو اس فارمولے کو منظور کر لیتا تو پاکستان کا ایک حصہ اس سے علیحدہ ہوتا یا نہیں لیکن ہر شخص ہمیشہ اپنی سوچ سمجھ سے کام لیتا ہے۔ وہ حالت کو جس صورت میں دیکھتا ہے، موقعے کے مطابق اس کا اسی طرح مقابلہ کرتا ہے۔ اگر بھٹو نے اپنے فیصلے میں بھول کی تو یہ اس کی سیاسی غلطی مانی جائے گی۔ لیکن اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس نے اپنی غرض اور مفاد کے لیے کوئی کام کیا۔

آئینی اور سیاسی زاویۂ نظر سے بھٹو اپنی جگہ درست ہے۔ کیونکہ اس نے اصرار کیا تھا کہ اگر پاکستان کو خود مختیار ریاستوں کی فیڈریشن بنا دیا جائے گا تو بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی مخالف پارٹی کی حیثیت سے بیٹھنے کو تیار ہے۔ لیکن اگر مجیب کے چھ پوائنٹس پروگرام کو پوری طرح منظور کر لیا جاتا اور پاکستان صرف ادھوری آزادی ریاستوں کی کنفیڈریشن بن جاتا تو یہ ضروری تھا کہ کنفیڈریشن میں شامل سبھی ریاستوں کو مرکزی حکومت میں حصہ ملنا چاہیے۔ اس دلیل پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور جو وجوہات ہوں وہ ہوں لیکن ایک وجہ یہی ہے کہ کنفیڈریشن قائم کرنے کی سیدھی سادی بناء یہ ہوتی ہے کہ اس میں شامل ریاست جس وقت بھی چاہے اس سے علیحدہ ہو کر خود کو آزاد قرار دے سکتی ہے۔ ایسی کنفیڈریشن کو ظاہر ہے کہ کسی ایسی پارٹی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جسے اکثریت حاصل ہو۔ ایسی حالت میں باقی ریاستیں اس کی ماتحت ہو جائیں گی۔

بچپن سے زلفی متحد پاکستان کا خواب دیکھتا رہا ہے۔ لیکن تازہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خواب چور چور ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے بھٹو نے جس ڈھنگ کا برتاؤ کیا۔ وہ اس حالت میں قطعی قدرتی تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود زلفی کی قوت برداشت پر حیران ہوں۔

یہ سچ ہے کہ زلفی پاکستان کے اتحاد کا کٹر حامی ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کی مناسب شکایتوں کی طرف سے آنکھ بند کر کے بیٹھنے کا رویہ نہیں اختیار کر سکتا تھا۔ ''دی گریٹ ٹریجڈی'' نام کی اپنی کتاب میں جو 29 ستمبر 1971ء کو شائع ہوئی جب کہ افسوس ناک واقعات اپنی آخری حد کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ بھٹو نے لکھا تھا:

''شیخ مجیب اور میرے درمیان چند اصولوں پر اختلاف پیدا ہوا۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف منصفانہ اصولوں کی جدوجہد تھی مجیب الرحمٰن کا خیال تھا کہ بنگال کو آزادی ملنا انساف کے حق میں ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ پاکستان کو متحدہ رکھنا انصاف کا تقاضا ہے''۔

صدر یحییٰ خان نے جب مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی کاروائی کو ملک کے ساتھ غداری کا نام دیا اور سختی سے اسے دبانا چاہا تو بھٹو نے جنرل پیرزادہ کو سمجھانے کی بے انتہا کوشش کی کہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ ہونے سے روکنے کے لئے محدود طریقے سے فوجی کاروائی کی جاسکتی ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان کو اس وقت تک نہیں بچایا جاسکتا، جب تک فوجی کاروائی کے ساتھ ہی کوئی سیاسی حل تلاش نہیں کیا جاتا اور مغربی پاکستان سیاسی اور مالی حلقوں میں مشرقی پاکستان پر سے اپنا قبضہ نہیں ہٹاتا۔ اور اس کا خون چوسنا بند نہیں کرتا۔

یحییٰ خان حکومت نے جو بربریت اختیار کی تھی بھٹو کو وہ قطعی پسند نہ تھی۔ 13 اگست 1971ء کو بھٹو نے کہا: ''جہاں من مانے ڈھنگ سے حکومت کی جارہی ہو اور بغیر سوچے سمجھے لوگوں پر کوڑے برسائے جارہے ہوں۔ جہاں لفظ فوج ہی آئین ہو وہاں انصاف، قانونی فرائض، بنیادی حقوق، قانونی حکومت اور طے شدہ قانون وغیرہ جیسی باتیں بے معنی ہیں ہیں اور پاکستانی عوام نے ان باتوں کو قطعی طور پر بھلا دیا ہے۔''

آخر تک بھتو یحییٰ خان کو حیوانی طاقت استعمال کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ تہران کے دورے سے واپس آنے پر بھٹو نے ایک خط یحییٰ خان کو لکھا تھا۔ تہران میں بھٹو نے کھلے عام کہا تھا کہ فوج پاکستان کے مسئلوں کو حل نہی کر سکتی۔ یحییٰ خان کو بھٹو نے اپنے خط میں لکھا تھا:

''ملک مصیبت کے جس دور سے گزر رہا ہے اس پر عوام کے تعاون کے بغیر عوام کے ہاتھوں ملک کی قسمت سونپے بغیر عوام کی سرکار بنائے بغیر فتح حاصل نہیں کی جاسکتی۔''

اس خط میں اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے منتخب نمائندوں کو متحدہ پاکستان کے تحت آئین بنانے کی ہدایت ہے اور آئین کو بنانے اور اسے لاگو کرنے سے پیشتر عوام کی منظوری لازمی ہے۔

یہ بتاتے ہوئے کہ یحییٰ خان کو آئین بنانے کا عوام سے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ بھٹو نے اعلان کیا تھا:

''کسی بھی آئین کو کامیابی کے ساتھ لاگو ہونے کی امید اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک وہ عوام کی خواہش کا آئینہ دار نہ ہو اور عوام اسے منظور نہ کرلیں۔

بھٹو نے لکھا تھا: ''اگر ضرورت پڑتی تو میں قومی مفاد کے لیے اس آئین پر انگوٹھا لگانے سے انکار کر دیتا جو مجیب الرحمٰن کی تخلیق ہوتا۔ حالانکہ اس آئین کو بنانے والے منتخب اسمبلی کے ممبران ہوتے۔ لیکن جب قومی مفاد کے حق میں میں فیصلہ کر سکتا ہوں تو مجھ سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ یحییٰ خان جیسے آمر کے بنائے گئے آئین کو میں آنکھ موند کر چپ تسلیم کرلوں گا۔''

اگر پاکستان میں ایسی طاقتیں ہوتیں جو اس کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے کوشش کرتیں تو شاید لقوط ڈھاکہ جیسا افسوس ناک واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے آئین کے ڈھانچے کے متعلق جب ہدایتیں جاری کی تھیں تو اس وقت انہیں یہ صاف ظاہر کر دینا چاہیے تھا کہ سبھی سیاسی پارٹیاں کس حد تک خود مختیاری کا مطالبہ کر سکتی ہیں اور پاکستان کو متحدہ رکھنے کے سلسلے میں کس حد تک اس طرح کے مطالبات کی تائید کی جاسکتی ہے۔

اگر شیخ مجیب کا چھ پوائنٹس کا پروگرام آئین کے ڈھانچے کے متعلق جاری کی گئی ہدایتوں کی حد سے باہر تھا تو انتخابات سے پیشتر ہی ان کے اس مطالبہ کو بات چیت کر کے یا اور دوسرے طریقوں سے ختم کر دیا جانا چاہیے تھا۔ اس وقت شیخ مجیب سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے انتخابات کی مہم کا ذریعہ اس پروگرام کو نہ بنائیں۔ لیکن اس بنیاد پر مجیب کو ایک مرتبہ انتخابات لڑنے اور کامیاب ہونے کا موقع دینے کے بعد اس پروگرام کو لاگو کئے جانے کی ان کی خواہش پر پابندی لگانا ناانصافی اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ایک احمقانہ بات ہوتی۔

اگر اس معاملے میں کچھ لوگوں کو گناہ گار قرار دیا جا سکتا ہے تو ضرورت سے زیادہ ڈھیل دینے کی پہلی ذمہ داری ایوب کی تھی اور اس کے بعد یحییٰ خان کی۔ اس کے لئے زلفی کو کسی بھی صورت میں ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آخر کار ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی نے بھی ایک طے شدہ مینی فیسٹو کی بناء پر انتخابات میں حصہ لیا تھا اور اس مینی فیسٹو میں لکھی ہوئی باتوں کا مطالعہ کرنا، ان کی تائید کرنا اور ان کی پبلسٹی کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کسی دوسری پارٹی کی بات کے لئے کیوں لڑتے جھگڑتے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ بھٹو کی خواہشات بلند نہیں تھیں اور نہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے پینترے نہیں بدل سکتا تھا یا اس میں پینترے بازی کی صلاحیت نہیں تھی جہاں تک اس کے بلند مقاصد قومی مفاد کو نقصان نہیں پہنچاتے وہاں تک بھٹو نے جو کچھ کیا مناسب تھا۔ یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں جو خون خرابہ ہوا وہ بھٹو کے اشارے پر ہوا۔ بیشتر لوگوں کی طرح بھٹو کو بھی بر بریت بھرے مظالم سے نفرت ہے۔ بہر حال بھٹو کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا ہیں لوگوں پر حیوانی مظالم ڈھانے کا ٹھیکہ کسی ایک طبقے یا کسی ایک ملک کا ہی نہیں ہے۔ کسی حد تک اس طرح کے مظالم ڈھانا سبھی ملکوں کے لوگوں کی عادت میں شامل ہے۔ یہ تو سماج کا فرض ہوتا ہے کہ وہ چند لوگوں کو اس طرح کے ظلم کرنے سے روکے۔ جب کوئی سماج کسی ایک معاملے میں قتل و غارت کو مناسب قرار دینے لگتا ہے اور کسی دوسرے معاملے میں اس کی برائی کرتا ہے تو اس سے بھی اتنے وسیع پیمانے پر انسانی مصیبتوں کی داستانوں کی ابتدا نہیں ہوتی۔

اگر اس بات کو رد کیا جا سکتا ہے تو قاری کو اس بات کا پورا حق ہے کہ وہ جو چاہے فیصلہ کرے۔ اوپر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں کافی ٹھوس ہی۔ اس بات کے بھی کافی ثبوت ہیں جو ذوالفقار علی بھٹو کے پس منظر سے حاصل ہوتے ہیں کہ بھٹو ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے پاکستان ٹاٹتا ہو۔ دوسری طرف اس کے خلاف اس بات کو ثابت کرنے کے بھی کئی ثبوت موجود ہیں کہ بھٹو مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کے باہمی فرق اور دشواریوں سے آشنا تھا اور ان کے متعلق ہوشیار بھی تھا۔ وہ بھٹو ہی تھا جس نے فوجی آمروں سے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ وہ انصاف کریں۔ اس طرح ملک کے اتحاد کی حفاظت کریں۔ بھٹو نے نہیں بلکہ یحییٰ خان نے بنگال میں فوجی کاروائی شروع کی تھی اور آخر میں یحییٰ خان ہی ڈھاکہ سے چپ چاپ بھاگ آیا تھا۔ تاکہ بھٹو ڈھاکہ کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے شیشے کے مینار سے یہ دیکھ سکے کہ پاکستانی فوج کتنی طاقتور ہے۔ کیونکہ 25 مارچ 1971ء کی اس فیصلہ کن رات جب توپوں اور بندوقوں نے آگ اگلنی شروع کی اور مشرقی بنگال جل اٹھا تو بھٹو وہی موجود تھا۔ اس نے ایک پاگل فوجی آمر کی اپنی ہی رعایا کو کچلنے کے لئے کی گئی کاروائی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

فوجی کاروائی کے مناظر دکھا کر بھٹو کو یہ سبق دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ فوج سے ہوشیار رہے۔ اس کا مقصد اسے ڈرانا دھمکانا تھا۔ لیکن اس سے بھٹو کے دل میں خوف کی بجائے نفرت، حقارت، غم اور افسوس ہی پیدا ہوا۔

کیا بھٹو اس سے خوفزدہ ہو گیا؟ نہیں۔ اس سے بھٹو نے ایک مرتبہ پھر سے یہ عہد کیا کہ وہ اس آمر کی بنیادیں ہی اکھاڑ پھینکے گا۔ اس نے 20 دسمبر 1971ء کو ایسا ہی کر کے دکھا دیا۔

سولہواں باب

فرض کی ادائیگی کے لئے بیقرار صدر

اکثر انتخابات کے مینی فیسٹو اس لیے ہوتے ہیں کہ ان سے وڈیروں کو اپنے جال میں پھنسایا جائے لیکن ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ یہ بات نہیں ہے۔ وہ اس بات کی پوری کوشش میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عوام سے جو وعدے کیے گئے ہیں، پورے کیے جائیں۔

پچھلی حکومتوں نے عوام کا خوب خون نچوڑا تھا اور ملک کی مالی حالت کو حد سے زیادہ بدتر بنا دیا تھا۔ اس سے بھٹو کے دل میں بڑی تلخی ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جس نے دسمبر 1971ء میں پاکستان کی حکومت سنبھالنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اسے اپنے فرائض کی ادائیگی جلد از جلد کرنی چاہیے۔

''دی بالٹی مور'' نام کے اخبار نے ان بہت سی نئی اصلاحات پر حیرت کا اظہار کیا ہے جو بھٹو کر رہا تھا یا کرنے جا رہا ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ روزانہ یہ فہرست لمبی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مسٹر بھٹو رات بھر کام کرتے ہیں اور تین یا چار گھنٹے ہی سوتے ہیں۔

بھٹو نے خود ہی اس سلسلے میں کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کم سے کم وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ اصلاحات کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اسی اخبار کو 16 جنوری 1972ء کو بتایا: ''اگر آپ امریکن لوگ یہ سوچتے ہیں کہ صدر فرینکلن روزویلٹ نے پہلے سو دنوں میں ہی معجزہ کر دکھایا تھا تو اب آپ ہمیں بھی دیکھیے۔''

بھٹو نے پاکستان کے صدر کے عہدے کی قسم 11 اپریل 1972ء کو لی۔ انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ قانون کے مطابق ہر شخص کے ساتھ انصاف کریں گے۔ اس کام میں نہ تو وہ کسی سے خوفزدہ ہوں گے اور نہ کسی کے ساتھ طرفداری کریں گے۔ نہ کسی سے دوستی رکھیں گے اور نہ کسی سے دشمنی۔ انہوں نے عہدہ ابھی سنبھالا ہی تھا کہ انہیں دس کروڑ روپیوں سے زیادہ کے پرمٹ رد کرنے پڑے کیونکہ یہ پرمٹ پچھلی حکومت نے ملک کے مٹھی بھر سرمایہ داروں کو دیئے تھے۔ پچھلی سرکار کا یہ کام طرفداری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

سرکاری پابندی لگاتے ہوئے بھٹو نے 11 خاص خاص انڈسٹریل یونٹوں کو سرکاری سپرویژن میں لے لیا۔ ان کارخانوں کا لاگت سرمایہ 25 کروڑ روپیہ تھا۔ ایک چھوٹا سا حکم جاری کر کے موٹر کار اور ٹریکٹروں کی برآمد روک دی گئی۔ وزیر مال کی صدارت میں ایک انڈسٹریل انتظامی بورڈ بنایا گیا جسے یہ کام سونپا گیا کہ ملک کے تیس خاص خاص کارکانوں کو سپرویژن میں لینے کے بعد ان کی دیکھ بھال کا معقول انتظام کرے۔

یہ محسوس کر کے کہ بھٹو اپنے ارادوں کا بہت پکا ہے، سرمایہ دار پاکستانیوں نے جو فارن کرنسی چھپا رکھی تھی، ظاہر کر دی۔ یہ رقم تقریباً 30 کروڑ روپیہ تھی۔ ان تجارون نے محسوس کیا کہ پکڑے جانے پر وہ اب رشوت دے کر بغیر سزا کے چھوٹ نہیں پائیں گے۔

غریب اور امیر کے درمیانی فرق کو مٹانے کی اپنی اعلان کی گئی پالیسی کے مطابق بھٹو نے پورے ملک میں تمام سرکاری ملازموں کی تنخواہوں کے اسکیلوں میں مناسب اور ضروری تبدیلیاں کیں۔ اس نے سب سے چھوٹے درجے کے ملازم کی تنخواہ میں 40 فیصدی اور سب سے اونچے کے ملازم کی تنخواہ میں 10 فیصدی کا اضافہ کر دیا۔ مکان کا کرایا اور آمد و رفت کا بھتہ بڑھا دیا اور جن سرکاری ملازمین کی تنخواہ پانچ سو روپے سے کم تھی، انکے بچوں کی تعلیم مفت کر دی۔

بھٹو نے یہ بھی صاف کہہ دیا کہ قومی مقصد پیداوار میں اضافہ کرنا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ مزدوروں کو منافع میں سے مناسب حصہ دیا جائے گا۔ سالانہ منافع میں مزدوروں کا حصہ بڑھا کر دو کی بجائے چار فیصد کر دیا گیا۔ 10 فیصد بونس بھی دینے کی گارنٹی دی گئی بشرطیکہ پیداوار

میں اضافہ کر دیا جائے۔

بھٹو خود ایک بہت بڑی زمینداری کا مالک تھا۔ کسی وقت اس کے پاس ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین تھی لیکن اس نے اپنی پالیسی کے مطابق زمین کے سلسلے میں انقلابی سدھار کیے۔ زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی اور ہر وہ قانونی کمی پوری کر دی گئی جس سے لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اس نے ایسے طریقے اختیار کیے جن سے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آیا جا سکے۔

تعلیم کار گر طریقے اور تیزی کے ساتھ دی جا سکے، اس کے لیے بھٹو نے ایک قانون پاس کیا جس میں یہ گارنٹی دی گئی کہ یکم اکتوبر 1972ء سے آٹھویں اسٹینڈرڈ تک پڑھنے والے بچوں کو اسکولی تعلیم مفت ملے گی اور یکم اکتوبر 1974ء سے دسویں اسٹینڈرڈ تک پڑھنے والے بچوں کو یہی سہولت حاصل ہوگی۔ ملک کے تمام پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس کے اس فیصلے سے عوام کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں یہ ابھی دیکھا جانا باقی ہے۔

اگر اس بات کی فکر کرنی چھوڑ دی جائے کہ بھٹو نے جو قانونی طریقے اختیار کیے ہیں، وہ رگر ثابت ہوں گے یا نہیں تو کم از کم بھٹو کی پالیسی ایمانداری کی ہے۔ جیسا کہ بھٹو نے ایک مرتبہ خود کہا تھا کہ ''پچھلی سرکاروں نے بہت سے اسکول بنائے لیکن ملک میں اسکول کی عمارتیں تو تھیں، ان میں طالب علم نہیں تھے۔ لیبارٹریاں تھیں لیکن ان میں ضروری ساز و سامان نہیں تھا۔ کلاس روم تو تھے لیکن مدرس نہیں تھے۔'' عوام اور افسروں کے درمیان تعلقات سدھارنے کے لیے محکمہ پولیس میں زبردست تبدیلیاں کیں اور اسے ایک نئی شکل دے دی گئی۔ سرکار نے ضلع صلاح کار کمیٹیاں قائم کیں جو پولیس اور عوام کے درمیانی تعلقات پر کھل کر اظہار خیال کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر ضلع میں کلکٹر کی ماتحتی میں ایسی عدالتیں قائم کی گئی ہیں جن میں حکومت کی بدانتظامی کے خلاف شکایتیں کی جا سکتی ہیں۔ اس نے پولیس کانسٹیبلوں کی تنخواہ بڑھا کر 110 روپے کر دی، اس بات کا انتظام کیا کہ پولیس کے ملازم کے اپاہج ہو جانے پر اسے پنشن دی جائے، اگر پولیس کا کوئی ملازم یا افسر فرض کی ادائیگی میں مارا جائے تو اس کے گھر والوں اور اس کی بیوہ کو پنشن ملے۔ ان سب کے علاوہ شاید عوام کی بہتری کا پروگرام سب سے زیادہ اہم ہے۔ پروگرام کے مطابق زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار حاصل ہوتا ہے۔ خاص کر ایسے لوگوں کو جو تکنیکی کام کرتے ہیں۔ یہ پروگرام ابھی شروعاتی حالت میں ہی ہے۔ لیکن اگر یہ کامیاب ہو گیا تو اس کے نتائج بہت ہی حیرت انگیز ہوں گے۔ سرکار کا مقصد یہ ہے کہ انسانی طاقت کو ہر درجے پر پوری طرح استعمال کیا جائے اور یہ تعمیری پروگرام عوام اور سرکار کے تعاون سے چلائے جائیں۔ دیگر باتوں کے علاوہ عوام کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ چند سالوں کے اندر ہی پاکستان کے بیشتر لوگوں کے پاس اپنا مکان ہوگا۔ خوانچہ والے سڑک پر بھومتے نظر نہ آئیں گے۔ ان کے پاس ایک ایک دکان ہوگی۔ لاتعلیمی ختم کر دی جائے گی اور چھوت سے پھیلنے والی بیماریوں پر قابو پا لیا جائیگا۔

یکم مارچ 1972ء کو قوم کو خطاب کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ ذاتی زمین کی حد میں بہت کمی کی جائیگی۔ سرکار کچھ لوگوں کو بہت زیادہ زمین اپنے ہاتھ میں رکھنے کی اجازت نہیں دے گی۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جبکہ جو لوگ ملک کے لیے دولت پیدا کرتے ہیں، بے بس ہو کر از حد افسوسناک حالت میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔

آبپاشی والے علاقے میں زمین کی حد جہاں 500 ایکڑ تھی گھٹا کر ڈیڑھ سو ایکڑ کر دی گئی۔ غیر آبپاشی کی زمین کی حد جہاں ایک ہزار ایکڑ تھی گھٹا کر تین سو ایکڑ کی دی گئی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا گیا کہ ''15000 پروڈیوس انڈیکس یونٹ'' سے زیادہ زمین کسی کے پاس نہیں رہے گی۔ دراصل نئے سدھاروں کا مقصد یہ تھا کہ زمین کی جو زیادہ سے زیادہ حد 1959ء کے لینڈ ریفارم ایکٹ کے بعد طے کی گئی تھی اس میں 70 فیصد کٹوتی کر دی گئی۔

اس کٹوتی کی ایک وجہ یہ تھی کہ سرکاری افسران نے 1959ء کے لینڈ ریفارم کے بعد قانون سے بچ نکلنے کی ترکیبیں نکال لی تھیں ۔ان کے پاس اب بھی بہت زمین تھی۔ نئے قانون کے تحت کوئی بھی سرکاری ملازم ملازمت کے دوران 100 ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں رکھ سکتا ۔اگر اس کے پاس اس سے زیادہ زمین ہوگی تو وہ اسے سرکار کے حوالے کر دینی ہوگی۔

نئی اصلاحات کے ذریعے کاشتکاروں کے حقوق کی حفاظت بھی کی گئی۔ دیگر باتوں کے علاوہ کاشتکاروں کو من مانے طریقے سے یا کسی خودغرضی کی وجہ سے بے دخل کرنے پر پابندی لگادی گئی۔ آبپاشی کے ٹیکس کی ادائیگی کی ذمہ داری کاکاروں پر نہ رکھ کر زمیندار پر ڈال دی گئی۔ زمینداروں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ کاشتکاروں کے لیے بیج مہیا کریں اور بیج کی قیمت خود ادا کریں۔

خواہ کسی بھی طرح دیکھیے یہ سدھار دراصل بہت ہی انقلابی تھے جیسا کہ بھٹو کا بیان ہے کہ ''نئے سدھاروں کے تحت زمین جو تنے والوں کو زمین کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں دینا ہوگا۔ وہی زمین کا نیا مالک ہوگا اور اس پر کسی طرح کا کوئی مالی بوجھ یا قرضہ نہیں رہے گا۔''

10 فروری 1972ء کو صدر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک نئی لیبر پالیسی کا اعلان کیا۔ اس کا مقصد مزدوروں کو ایسے بنیادی حقوق عطا کرنا تھا جو ملک کی انڈسٹری کی ترقی کے نظریہ سے ضروری اور اس کے حق میں ہوں۔ اس پالیسی کے تحت مزدوروں کو کارخانوں کی انتظامیہ میں حصہ دینے کا قانون بنایا گیا۔ انتظامیہ بورڈ میں مزدوروں کے نمائندے کارخانے کے معیار کے مطابق 20 فیصد رکھے جاسکتے ہیں۔

بھٹو نے ایسا بھی انتظام کیا کہ مزدوروں کو پیداوار میں اضافہ ہونے پر اس کا معقول منافع ملے۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ آئندہ مزدوروں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کارخانے کے حساب کتاب، ریکارڈ اور اسٹور کی جانچ کے لیے کوئی آڈیٹر مقرر کرسکیں گے کا معاوضہ کارخانے کی انتظامیہ ادا کرے گی۔

موجودہ قانون کے تحت مزدوروں کو سالانہ منافع میں سے دو فی صد منافع دینے کا قانون ہے، نئے قانون میں اس میں چار فیصد تک اضافہ کر دیا جائے گا۔ اگر مزدور پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں تو انہیں منافع کرتے ہیں تو انہیں منافع کا دس فیصد تک اور مل سکتا ہے۔

کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور انتظامیہ کے درمیان تال میل قائم رکھنے کے لیے اگر مزدوروں کی شکائتیں مناسب مدت میں دور نہیں کی جاتیں تو مزدور انتظامیہ کی توجہ اپنی شکایتوں کی طرف دلا سکتا ہے۔ دوکانوں میں کام کرنے والے مزدور کی شکایتیں ایک مقررہ مدت میں دور نہیں کی جاتیں تو وہ معاملہ لیبر کورٹ میں لے جاسکتا ہے۔ لیبر کورٹ اپنا فیصلہ بیس دن کے اندر دیدے گی۔ پہلے فیصلہ دینے کی مدت 60 دن تھی۔

دوسری طرف مزدور کہیں، اپنے حقوق کا ناجائز استعمال نہ کریں، اور اکثریت کے مخالف ہوتے ہوئے ہڑتال نہ شروع کر دیں۔ اس لیے قانون میں ایسا قاعدہ بنایا گیا ہے کہ کسی بھی ہڑتال کو شروع کرنے سے پہلے یونین کو خفیہ طور پر ووٹ ڈلوا کر یہ جاننا ہوگا کہ ہڑتال کی جائے یا نہیں۔ نئے قانون میں مزدوروں کی تنخواہ کو کارخانے کی پیداور سے حاصل ہونے والی رقم سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیداوار میں جس طرح اضافہ ہوتا جائے گا مزدوروں کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا جائیگا جیسا کہ بھٹو نے صاف طور پر تسلیم کیا ہے کہ پاکستان پیداوار کی کمی کی مشکلات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ ان مشکلات پر تبھی فتح حاصل کی جاسکتی ہے جبکہ پورا سماج متحد ہو کر قومی سرمایہ کی اضافت میں جٹ جائے۔

گھیراؤ تحریکوں کی سختی سے برائی کرتے ہوئے جو مزدوروں کے جھگڑے کا افسوسناک حصہ بن گئی تھیں، بھٹو نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ گھیراؤ ایک ایسی حرکت ہے جس سے خود کو ہی نقصان پہنچتا ہے۔ بیشتر لوگ ان مظاہروں سے تنگ آچکے ہیں۔ کیونکہ یہ ہلڑ بازی کے علاوہ

اور کچھ نہیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ چاہتے ہیں کہ مخالفت کے سمجھداری اور شرافت سے بھر طریقے اختیار کیے جائیں۔

اگر لیکچر بازی پر غور نہ کیا جائے تو بھٹو نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر مزدور مناسب برتاؤ نہ کریں گے تو سڑکوں پر ہلڑ بازی کرنے والوں کو سرکاری طاقت کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ حالت کو نارمل بنانے کے لیے بھٹو نے آخری اپیل کرتے ہوئے مزدوروں سے کہا کہ وہ اور دہم بازی ختم کریں۔ اگر آئندہ کوئی بھی غیر قانونی مظاہرہ ہوا تو اس کا مقابلہ پوری طاقت سے کیا جائیگا۔

بیشتر سماج وادی سرکاروں نے اپنے یہاں کے مزدوروں سے ایسے وعدے کیے ہیں جو پورے نہیں ہو سکتے، اور جب الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا وال آتا ہے تو گھاٹا دکھانے اور دیوالیہ ہونے کے طریقون کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بھٹو نے کم از کم ایمانداری سے اپنے ملک کے مزدوروں کو یہ صاف صاف تو بتا دیا کہ اگر وہ قومی سرمائے میں سے حصہ چاہتے ہیں تو انہین قومی پیداوار میں اضافہ کرنا ہوگا، اور جب تک قومی خوشحالی میں اضافہ نہیں ہوتا تب تک عوام میں بھی خوشحالی نہیں آسکتی۔

مزدوروں کے لیے ''حقوق کا عظیم ہدایت نامہ'' جاری کرتے ہوئے پاکستان کے لیبر منسٹر محمد حنیف نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مزدوروں کو جو سہولیتں دی جارہی ہیں۔ انہیں خیرات نہیں سمجھنا چاہیے۔ مزدوروں کو دی جانے والی رقم کو کسی بھی کارخانے کی منافع کمانے کی صلاحیت سے وابستہ کر دیا جانا چاہیے۔

بونس اور تنخواہ کی رقموں کی ادائیگی نئی پالیسی کے تحت ضروری ہے، لیکن یہ سب پیداوار کے اضافے سے وابستہ ہے۔ زیادہ بونس اور خاص مالی ترجیح کے علاوہ کچھ اور معمولی سہولتیں بھی دی گئی ہیں۔ جیسے کارخانے کا مالک مزدور کے کسی ایک بچے کو میٹرک تک کی تعلیم دینے کا ذمہ خود لے گا۔ اس کے خرچ کا کوئی بھی حصہ مزدور کو اپنے پاس سے نہیں دینا پڑیگا۔ کسی بھی مزدور کو ملازمت سے اس وقت تک نہیں ہٹایا جاسکتا جب تک اس کی ملازمت ختم کرنے کے نوٹس میں برخاستگی کی وجوہات صاف نہیں کر دی جاتیں۔

ٹریڈ یونین تحریک کو مضبوط بنایا گیا ہے لیکن حقوق کے اضافوں کے ساتھ ہی فرائض میں بھی اضافہ کیا گیا ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصلی تنخواہوں کے عام معیار میں تبھی سدھار ہوگا جب کل پیداوار میں اضافہ ہو جائیگا۔

ایک اور بات دیکھ کر حیرت زدہ ہونا پڑتا ہے کہ بینک رعایتی شرطوں پر کچھ ایسی پارٹیوں کو بغیر ضمانت دیئے قرض دیتے رہتے تھے۔ ان قرضوں کی ادائیگی کی کبھی امید ہی نہیں تھی۔ اب یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اب بینک چند دولت مند گھرانوں کی جاگیر نہیں رہ گئے ہیں اور نہ ان کے ڈائریکٹروں کے لیے سہولت کے نام پر بہت آرام کا انتظام ہی کیا جاتا ہے۔ انہیں جو ادائیگی ہوتی ہے روزانہ بھتوں کی شکل میں ہوتی ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ وہ کسی بیٹھک میں حاضر ہوتے ہیں یا حصہ لے رہے ہوتے ہیں۔

کرنسی ایکسچینج کے معاملے میں وزیر مال نے صاف طور پر یہ تسلیم کیا کہ حال کے برسوں میں فارن کرنسی کے خرچ میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے پاکستان کے مالی نظم ونسق کو گھاٹے کی حالت پر منحصر رہنا پڑتا ہے۔

1968-96ء میں کرنسی کا پھیلاؤ 170 کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ سرکار زیادہ سے زیادہ نوٹ چھاپتی چلی گئی اور اس نے پیداوار بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک برس کے اندر کرنسی کے پھیلاؤ میں 100 کروڑ روپے کا اور اضافہ ہو گیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک سرکار ابھی حال ہی میں تبدیل نہیں ہوئی۔

بھٹو سرکار اس تلخ حقیقت کا مقابلہ کر کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ سرمائے کے لیے زیادہ پیداوار ہونا چاہیے۔

وزیر خارجہ نے یہ تسلیم کیا کہ پرمٹ اور کوٹا سسٹم کی وجہ سے کرپشن، کالا بازار اور جمع خوری میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سے اثر دار لوگ اور جن لوگوں کا میل جول بڑے بڑے افسروں سے تھا، راتوں رات دولت مند بن بیٹھے ہیں۔

یہ طریقہ اب ختم کر دیا گیا ہے۔ اب چھوٹے کارخانے کے مالکوں کو تکلیفیں برداشت نہیں کرنی ہوں گی۔ کارخانیکی ایسی مشینیں جن کی قیمت پانچ لاکھ روپے سے کم ہے۔ باہری ملکوں کی مدد اور کرنسی کی ادلا بدلی کی بناء پر درآمد کی جاسکتی ہیں اور جن مشینوں کی قیمت دو لاکھ روپے سے کم ہے نقد بھگتان کر کے ملک میں لائی جاسکتی ہیں۔

سرکار ایسے لوگوں کو خاص طور پر ترجیح دے گی جو امداد اور ایکسچینج کا صحیح استعمال کریں گے۔

مشروط امداد اور ایکسچینج کی بنا پر خام مال کی درآمد پر ٹیکس میں ان لوگوں کو چھوٹ دی جائیگی۔

اس کے علاوہ اخباروں کو بھی آزادی دی گئی۔ زبان کے معاملے میں سمجھوتا ہو گیا۔ عدالتوں میں ایسے بنیادی سدھار کیے گئے جن سے مقدموں کی شنوائی بہتر طریقے سے کی جاسکے۔

پاکستان کے فوجی لیڈروں کی رائے تھی کہ کسی بھی قوم کو قابو میں رکھنے کے لیے طاقت درکار ہے۔ اسکے خلاف بھٹو کا اعتقاد جمہوری حکومت میں ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ کوئی بھی سرکار اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتی یا کسی بھی ملک کو اس وقت تک خوش حال نہیں بنایا جاسکتا جب تک اسے اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔ حال کے واقعات کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب ایک دوسرے کے مخالف بن گئے ہیں۔ خاص طور پر شیخ مجیب الرحمٰن نے کئی مرتبہ مخالفت میں بھٹو کے بارمیں ایسی رائے ظاہر کی ہے کہ جس سے جھگڑا اور بھی بڑھے۔ اس نے کئی مترتبہ اس صدر کو نیچے گرانے کی کوشش کی ہے جو آج اس کٹے پھٹے مغربی پاکستان کا صدر ہے جس کی عزت خاک میں مل چکی ہو۔

لوگوں کی یادداشت بہت تھوڑے وقت تک ساتھ دیتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر آج مجیب زندہ ہیں اور بنگلہ دیش کے وزیر اعظم ہیں تو اس کے لیے انہیں ذوالفقار علی بھٹو کا ممنون ہونا چاہیے۔ یحییٰ خان کی حکومت کے دوران شیخ مجیب کی زندگی کی قیمت دو کوڑی کی تھی نہ تھی جب کہ دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ یحییٰ نے حکومت بھٹو کو سونپنے کے بعد یہ خطرناک مشورہ دیا تھا کہ وہ مجیب کو سزائے موت دیدے اور اس حکم نامہ پر پچھلی کوئی تاریخ ڈال دی جائے۔ میں بڑی خوشی سے اس حکم نامہ پر دستخط کر دوں گا اور مجیب کو مانے کا الزام اپنے سر لے لوں گا۔ یحییٰ خان کا یہ مشورہ ایک شکست خوردہ شخص کی انتقامی کاروائی تھی۔ اس میں نہ رتی بھر انسانیت تھی اور نہ کسی فوجی روایت کی بہادری کا حصہ تھا۔

لیکن زلفی اس بات کو منظور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی عادت ایسی نہیں ہے۔ کسی بھی شخص کی جان اس قدر بے رحمی سے لینا اس کے لیے ناممکن ہے اور پھر اس الزام کو کسی دوسرے کے سر تھوپنا تو اس کے اصولوں کے بالکل ہی خلاف ہے۔ تقریباً ایک منٹ تک بھٹو یحییٰ خان کو سر سے پیر تک، اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا کہ وہ ایسی احمقانہ بات بھلا دے۔ مجیب کو جلد ہی محفوظ طریقے سے رہا کر دیا جائیگا۔

اپنی نئی کتاب ''ڈسٹینٹ نیر'' میں کلایپ نیر نے مجیب کی رہائی سے پہلے کے واقعات کے متعلق شک ظاہر کیا ہے۔ نیر کے مطابق بھٹو نے انہیں بتایا تھا:

''23 دسمبر کو جب پہلی مرتبہ ہماری ملاقات ہوئی تو مجیب نے قرآن اٹھا کر کہا۔ کہ 'میں ایک اچھا مسلمان ہوں۔ میں اب بھی چاہتا ہوں کہ ملک کی حفاظت وسلامتی، باہری ملکوں کے معاملے اور کرنسی مرکز کے ہاتھ میں رہے۔'

''27 دسمبر کو جب ہماری دوسری مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ قطعی صاف نہیں تھے۔ انہوں نے کہا: 'میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرکز کے ہاتھ میں کتنے معاملے دیے جائیں گے اور وہ کون کون سے ہوں گے۔ لیکن دونوں حصے ہر حال میں جڑے رہیں گے۔ میں تعلق بنائے رکھنا چاہتا

ہوں۔'

''مجھے شک تھا، میں نے مجیب سے کہا: 'جیسا کہ آپ جانتے ہیں آپ یہ بات یہاں کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کے وعدے کو تسلیم کیے لیتا ہوں۔ لیکن جب آپ وہاں جائیں گے اور حالات کو خود اپنی آنکھ سے دیکھیں گے اور جب آپ یہ محسوس کریں گے آپ اپنی قبر سے واپس لوٹ آئے ہیں تو آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ نہیں کر پائیں گے۔' لیکن مجیب نے پھر اسی یقین کے ساتھ کہا: 'نہیں نہیں میں لیڈر ہوں۔ میں ٹھیک کروں گا۔' اور اسی طرح کی اور باتیں بھی کیں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ میں مجیب کو چاہتا ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ مسئلے اس قدر زیادہ ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس میں سے آدھے مسئلوں کو بھی حل کرنے کو تیار ہو پاتے۔''

بعد میں کلدیپ نیر نے مجیب سے بھی ملاقات کی اور اس واقع کے متعلق بھٹو نے جو کچھ انہیں بتایا تھا وہ انہوں نے مجیب کو بتا دیا۔ مجیب نے صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جب انہوں نے قرآن کی قسم کھا کر کوئی بات کہی ہو۔ یہ بالکل من گھڑت ہے۔

دراصل مجیب نے کلدیپ نیر کو بتایا کہ ''بھٹو بہت ہی جھوٹا آدمی ہے۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ کیونکہ اس نے میری زندگی کی حفاظت کی لیکن اسے جھوٹی باتیں پھیلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

مجیب اور بھٹو کے بیانوں کے سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنے کے لیے کلدیپ نے مجیب کی طرفداری کی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے۔

''دونوں حوالے ٹھیک اسی قدر مختلف ہیں جس قدر ان کو بیان کیرنے والوں کی زندگیاں۔ بھٹو معمولی سی بات پر بھڑک اٹھنے والا ہے۔ اس کے خیالوں میں پختگی نہیں ہے لیکن مجیب خاموش، سیدھا سادہ اور صف گو ہے۔ بھٹو ایک لمحہ گرم ہو جاتے ہیں اور دوسرے لمحہ ٹھنڈے جبکہ مجیب میں یقین اور صبر و استقلال ہے۔''

ان حالات میں کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ بھٹو اور مجیب اپنی اپنی بات پر اڑے رہیں گے لیکن بھٹو کو بھڑک اٹھنے والا اور مجیب کو صابر بتانا سطحی مطالعہ کہا جائے گا۔ اس کا حقیقت بیانی کی صلاحیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ہندوستان کا رجحان یہ رہا ہے کہ مجیب الرحمٰن کو اچھالا جائے۔ ان کی تعریف کی جائے اور بھٹو کو دوسروں کی نظروں میں گرایا جائے اور اسے معمولی آدمی بتایا جائے۔ اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نیر نے مجیب کو قابل اعتبار اور بھٹو کو ناقابل اعتبار بتایا ہے لیکن اگر اس واقعہ کو اس سلسلے میں دیکھا جائے تو یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ سب باتیں بھٹو کی من گھڑت باتیں ہیں۔ کیا یہ تیقین کرنیکے قابل ہے کہ مجیب مہینوں تک اس کال کوٹھری میں رہنے کے بعد، جہاں کسیبھی لمحے انہیں قتل کیا جا سکتا تھا۔ بھٹو کی کسی بات کو نامنظور کر دیتے جو بھٹو انہیں زندگی اور آزادی دے کر منظور کرانا چاہتا تھا۔؟

ایسے وطن پرست دیوانے ہوئے ہیں جنہوں نے مخالف حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے خود کو اپنے ملک کے لیے قربان کر دیا لیکن اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پاکستان کو شکست مل چکی ہے۔ بھٹو کے دل میں مجیب کے لیے کسی طرح کی نفرت نہیں تھی اور اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ بھٹو جو کچھ چاہتا تھا محض ایک سیاسی وعدہ تھا جس سے کہ پاکستان کے اتحاد کی حفاظت کی جا سکے۔ اس واقعہ کی اگر غیر جانبداری سے تشریح کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجیب نے ضرور ہی ایسا وعدہ کیا ہوگا لیکن بعد میں یہ دیکھا ہوگا کہ اب اس وعدے پر قائم رہنے کی کوئی ضرورت ہی ایسا وعدہ کیا ہوگا لیکن بعد میں یہ دیکھا ہوگا کہ اب اس وعدے پر قائم رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اب خطرے سے باہر آ چکے ہیں یا پھر یہ کہ بھٹو نے یہ وعدہ مخالف حالات میں دباؤ ڈال کر زور زبردستی سے لیا تھا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق کبھی دشمنی ظاہر نہیں کی۔ بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے ریکارڈ میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ یہ پارٹی اکثر مجیب کی پالیسیوں کی مخالف رہی ہے لیکن مخالف ہونے کے باوجود اپنی عقل اور ہوش کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ جب بھٹو نے مجیب کا چھ پوائنٹس فارمولہ نامنظور کر دیا تو اس نے یہ کام نہایت پرسکون ہو کر بغیر کسی جوش کے کیا تھا اس نے ایک ایک بات کی تردید کی۔ نہ وہ خوفزدہ ہوا اور نہ گھبرایا جیسا کہ بعد میں یحییٰ خان نے کیا۔ بھٹو نے مجیب کی کسی بھی پیشکش کو ملک سے غداری کا نام نہیں دیا اور نہ یہ کہا کہ مجیب نے یہ چھ پوائنٹس پروگرام پاکستان کو برباد کرنے کے لیے بنایا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مجیب جو کچھ چاہتے تھے اور بھٹو نے جو کچھ منصفانہ اور ضروری تسلیم کیا تھا ان دونوں میں درحقیقت فرق بہت ہی معمولی سا ہے۔ بعد میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک بک لیٹ شائع کی تھی۔ اسکے حوالہ سے مجیب کے لیے گہری دشمنی بالکل ظاہر نہیں ہوتی۔ دراصل عوامی لیگ کی قراردادوں کو نامنظور کرنے کے باوجود چند ایسے حوالے ہیں جن مین مجیب کی خواہشات کی تائید کی گئی اور مجیب کو اہم اور خاص سیاسی لیڈر قرار دیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ تمام باتیں مشرقی پاکستان کے افسوسناک واقعات سے بہت پہلے لکھی گئی تھیں جو خود اپنے آپ میں میرے بیان کی تصدیق کرتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ڈیڑھ برس ہو گیا جبکہ عوامی لیگ پارٹی کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ انہوں نے ہی چھ پوائنٹس پروگرام بنایا تھا۔ اسی وقت سے وہ جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ کسی بھی انسان کو جیل میں ڈالا جا سکتا ہے مگر خیالات کو زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ چھ پوائنٹس پروگرام کے اس خالق کی آزادی چین لی گئی ہے لیکن اس نے اپنے دماغ سے جو باتیں سوچ کر نکالی تھیں۔ آپ سب کو معلوم ہیں خاص طور سے جن جذبات سے متاثر ہو کر اس نے یہ پروگرام بنایا تھا، وہ جذبات آج بھی لاکھوں لوگوں کے دلوں میں ہیں۔

''اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان خیالات کا مطالعہ کیا جائے۔ ان پر غور وخوض کیا جائے ان کے متعلق مباحثے کیے جائیں۔ بھلے ہی ان کے نقادوں کو جواب دینے سے کیوں نہ روک دیا جائے لیکن یہ راستہ زیادہ مناسب ہے۔ منصفانہ بھی ہے۔ اگر آج شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کر دیا جائے تو وہ تقریروں اور مضامین کے ذریعے اپنے پروگرام کا خلاصہ کریں گے اور اس کی تائید کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے شبہات بھی دور کر سکتے ہیں جو ان کے ارادوں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہو سکتے ہیں۔ شاید وہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اچھی طرح غور وخوض کرنیکے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں آخر کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے جو یہ ریزولیوشن پیش کیے ہیں ،ان کا اثر ٹھیک وہی ہوگا جو انہوں نے کہا ہے۔ بہت سی ایسی دوائیں ہوتی ہیں جنہیں ڈاکٹر دیتے رہتے ہیں لیکن بعد مینجب ان کی معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے تو پتہ لگتا ہے کہ وہ دوائیں کسی مخصوص مرض کا اثر دار علاج نہیں تھیں۔''

بھٹو نے مجیب کی تردید نہیں کی۔ بلکہ اس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ مغربی پاکستان نے جو برتاؤ کیا ہے، اس کی وجہ سے مجیب کی ناراضگی قدرتی اور لازمی ہے۔ بھٹو مجیب کی اس ناراضگی کو دل سے تسلیم کرتے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

''تلخ حقیقتوں کی طرف سے آنکھ موند کر ملک کی سچی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ خوبصورت الفاظ نصیحتوں اور طرح طرح کے بہانوں سے ملک کی خطرناک مالی حالت اور سماج کے مسائل کا حل نہیں نکل سکتا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوگا کہ ہم لوگ ان لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ وہ حالت کیا ہیجس کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمٰن کو چھ پوائنٹس مطالبہ کے پروگرام کو بنانا پڑا۔ اگر اس بات کو صحیح طریقے سے سمجھ لیا جائے تو مسائل کا جواب مل سکتا ہے''۔

''ملک کے دونوں حصوں کے لوگوں میں نفرت پھیلانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ وہ ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔ جہاں جہاں بھی اقتصادی منفعت کو سیاسی سوالوں سے جوڑا گیا ہے۔ وہاں وہاں اس گڑبڑ کی بنیاد کا پتہ لگا ہے تو یہی بات سامنے آئی ہے کہ ان سب کے پیچھے ایسے طبقوں کی خودغرضی ہے جنہیں مخصوص حقوق حاصل ہیں۔ خواہ عوام کسی بھی علاقے کے ہوں انہی کا خون چوسا گیا ہے۔''

بھٹو نے کافی تفصیل کے ساتھ یہ کہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ متعصّبانہ سلوک اور زیادتی کی گئی ہے۔ بھٹو مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کرنے کے حق میں تو ہے لیکن وہ پاکستان کے دو ٹکڑے کر دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مسئلے کا حل نکل سکتا تھا لیکن اس کے لیے بہت زیادہ کوشش کرنی پڑتی اور دونوں پارٹیو میں سمجھوتے کے لیے یک جہتی وہم آہنگی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ ملک کو فوجی حکومت کے شکنجے سے نجات دلائی جاتی اور پاکستان میں غیر فوجی حکومت قائم کی جاتی۔ بھٹو کو یہ اچھیطرح معلوم تھا کہ مشرقی پاکستانیوں کا غم وغصہ جائز ہے جیسا کہ اس کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

''فوج کے اخراجات میں توازن نہیں ہے۔ حالانکہ یہ خرچ بہت بڑا ہے لیکن ایسا نہیں ہے جو وقت کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جائے۔ یہ گھٹ بھی سکتا تھا۔ پہلے آہستہ آہستہ اور بعد میں تیزی کے ساتھ۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ پاکستان میں شروع سے ہی اونچی تعلیم کے ادارے قائم کیے جاتے۔ کیونکہ ایسا نہی کیا گیا اس لیے جو ہونا ضروری تھا وہی ہوا۔ تعلیم کا معیار بجائے اوپر اٹھنے کے نیچے گرتا چلا گیا۔''

''اس کے برخلاف مغربی پاکستان میں تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ سرکار کی مالی پالیسی کی وجہ سے جو نیا سرمایہ دار طبقہ ابھرا اس طبقے کے گھرانوں کے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہری ممالک میں جانے کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ہماری مالی پالیسی ایسی تھی جس سے مشرقی پاکستان میں تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں یہ فرق ہی اختلاف کی خاص وجہ تھی۔

''اس لیے ڈھیلی ڈھالی مالی پالیسی ہی گڑبڑی کی اصلی وجہ ہے۔ بھاری مشینیں بنانے والے کارخانوں کو قائم کرنیکی کوئی کوشش نہیں کی گئی تا کہ خودکفیل ہونے اور خوداعتمادی کی بنیاد پڑتی۔ لیکن اس کے لیے سرکار کو بہت بڑا بہت سرمایہ لگانا پڑتا کیونکہ یہ کارخانے منافع فوراً ہی نہیں دیتے۔ اس بات پر بھی برابر زور دیا جاتا رہا کہ عوامی حلقوں میں ایسے خارخانے قائم کیے جائیں جو جلد از جلد منافع دے سکیں۔ اس طرح سے محفوظ اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے جذبہ سے بری کارخانوں کے رحم وکرم پر محض تو بے بس خریدار کو چھوڑ دیا گیا۔ جس کا یہ تجار اور کارخانوں کے مالک سخت بے شرمی کے ساتھ خون چوستے رہے''۔

ان باتوں کو تسلیم کرنے کے لیے سیاست داں کا کلیجہ بہت بڑا ہونا چاہیے بھٹو نے مشرقی پاکستان لوگوں کی جو حمایت کی تھی اس سے اس صوبے کے لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ بھٹو ان کی طرفداری اس وقت تک کرتا رہے گا جس وقت تک خود شیخ مجیب یہ کہتے تھے کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان مُس اتحاد بنائے رکھنے کے خلاف نہیں ہیں۔

لیکن بعد میں واقعات نے اس تیزی سے گردش کی کہ مجیب کو علیحدہ ملک بنانے کے لیے کام کرنا پڑا۔

رگ رگ میں قوم پرستی بھری ہونے کی وجہ سے اور پاکستان کو متحد رکھنے کی خواہش سے اس وقت بھی جبکہ اتحاد ناممکن تھا بھٹو کو مجیب جیسے مخالف فریق کے ساتھ ملنا پڑا۔ اس طرح کی جدوجہد تاریخ میں اکثر ہوئی ہے۔ اگر مجیب انہی کوششوں میں ناکام ہوجاتے تو انہیں ملک کا غدار کہا جاتا۔ لیکن مجیب کو جب کامیابی حاصل ہوگئی تو بھٹو نے دیکھا کہ وہ ایک ایسی عجیب وغریب حالت میں ہے جب انہیں ری ایکشنری سمجھا جاسکتا ہے جو ایک پورے ملک کو، اس کے باشندوں کی خواہش کے خلاف غلام بنائیر کھنا چاہتا ہے۔

سترھواں باب

امن کی تلاش

بھٹو کے پاکستان کے صدر بن جانے کے بعد اخبارات اور رسالے میرے پیچھے پڑے رہے کہ میں بھٹو کی بابت مضمون لکھوں اور میں اس پیشکش کو جہاں تک بن پڑا ٹھکراتا چلا گیا۔ پھر بھی بات چیت کے دوران پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں میں جو کچھ بھی بھٹو کے متعلق کہہ دیتا، وہ ادھر ادھر اخبارات بھٹو کے خلاف خبریں شائع کرتے رہے ہیں۔ میں بھٹو سے 36 برس سے واقف ہوں۔ اس لیے میں نے محسوس کیا کہ بھٹو کے خلاف اس طرح کی خبریں شائع کیا جانا انصاف کی نظر سے مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ میں صحیح باتیں بتادوں۔ اس لیے میں ''السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا'' کو ایک انٹرویو دینے کے لیے رضامند ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ رسالہ بھٹو کی صحیح اور حقیقی تصویر پیش کر سکے گا۔ میں اپنے البم سے کئی فوٹو بھی اس ہفتہ وار رسالہ کو دیے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ میرے انٹرویو کے ساتھ کچھ مضمون اور بھی شائع ہوئے جن میں سے کچھ سخت تھے اور کچھ غلطیوں سے بھرے ہوئے لہٰذا اس سے وہ مقصد پیدا نہ ہو سکا جس مقصد سے میں اس ہفتہ وار رسالے کو انٹرویو دینے کے لیے رضامند ہوا تھا۔

ان دنوں بے شمار لوگوں مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا میں نے بھٹو کو صدر ہونے پر مبارکباد کا خط لکھا ہے؟ میں یہ کہتا رہا کہ خط لکھنا ضروری نہیں ہے اور مجھے پختہ یقین ہے کہ وہ میرے دلی جذبات سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے فوراً بعد مجھے زلفی کا ایک بہت لمبا خط موصول ہوا۔ اس نے میرا انٹرویو پڑھا تھا اور اسی کی وجہ سے شاید اس نے وہ خط لکھا تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس نے یہ بھی لکھا تھا:

''مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری دوستی آج بھی قائم ہے۔ خواہ کتنا ہی وقت گزر جائے اور وقت کے ساتھ ساتھ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے، ہمارے تعلقات اس قدر گہرے ہیں کہ خواہ ہم باہم کوئی رابطہ رکھیں یا نہ رکھیں ہماری دوستی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ بہت سے موقعوں پر مجھے اسکول اور یونیورسٹی کے وہ ہنسی خوشی بھرے دن یاد آتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جب میں نے اپنے ملک کی باگ ڈور سب سے زیادہ مصیبت کی گھڑی میں سنبھالی تو میری یہ خواہش ہوئی کہ تمہیں ٹیلی فون کروں۔ لیکن میں نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا کیونکہ سوچنے پر مجھے لگا کہ ہمارے دونوں ہی ملکوں میں تنگ نظر لوگوں اور بیوقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہماری جلد ہی ملاقات ہوگی۔ کیونکہ واقعات کچھ اس طرح ظہور میں آرہے ہیں جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ ہماری ملاقات ممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ہی ملکوں کے لوگ نفرت اور شک کے راستے سے واپس آنا چاہتے ہیں اور وہ دوستی اور امن چاہتے ہیں۔ یہ سوچ کر ترس آتا ہے۔ ترس ہی نہیں بلکہ گہرا دکھ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں نے کتنے بیش قیمت سال یوں ہی ضائع کر دیئے اور اس ڈھرے میں ہندوستان اور پاکستان کے غریب اور بے بس لوگ دکھوں کی چکی پستے رہے۔

''آج صبح میں نے 23 جنوری 1972ء کا 'السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا' دیکھا اس میں میری بابت ایک مضمون ہے جو فوٹو گراف شائع ہوئے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے یک لخت گزرے دنوں کی یاد آ گئی۔ لاس اینجلس میں ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے جو فوٹو ہے وہ ٹینس کورٹ کے باہر کا ہے۔ دوسرا فوٹو عمر قریشی کے ساتھ ہے جو 'بیل اسیر'' بیورلی ہلز کے لان پر کھینچا گیا تھا اور جب تمہارے والدین امریکہ کے سفر پر آئے ہوئے تھے، 'پام اسپرنگس' پر فوٹو لیا گیا ہے۔ اس سے مجھے وہ بات چیت یاد آئی جو ہم لوگوں کے درمیان اس وقت ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں اس بات کی یاد ہوگی۔ لیکن تم نے خود ہی اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ 1946ء میں ولنگڈن کلب کے جو فوٹو گراف ہیں ان سے بھی مجھے اس وقت کی بات چیت یاد آئی۔ ایک گروپ فوٹو گراف عمر قریشی کی دوست میری جین فنچ کے گھر پر لیا گیا تھا''۔

زلفی کا یہ خط ملنے کے بعد میں نے سوچا کہ میں وطن پرستی کا اپنا فرض پورا کروں۔ اس لیے میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملا اور

انہیں ذوالفقار علی بھٹو کی بابت اپنے خیال بتائے اور کہا کہ میں بھٹو جیسے شخص کو سمجھنے میں ان کی مدد کرسکتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان میں بھٹو کو جیسا سمجھا جاتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف شخص ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی مشورہ دیا کہ پاکستان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا یہ بہت ہی بہتر موقع ہے اور پاکستان کی طرف سے بھٹو سے بہتر آدمی ہندوستان کو نہیں مل سکتا۔ اس کے بعد میں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ میں ہندوستان کو نہیں مل سکتا۔ اس کے بعد میں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ میں ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے معاملوں میں کسی طرح الجھ نہ جاؤں۔

میں نے زلفی کے خط کا جواب مارچ کے آخر میں دیا۔ اس کا جواب بھی مجھے ملا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ یہ خط سیدھا میرے پاس نہیں آیا۔ یہ خط مجھے وزارت خارجہ کی معرفت موصول ہوا جو کسی دوسرے آدمی کے ذریعے لکھے پیغام کی شکل میں تھا۔ اس پر کوئی تاریخ، القاب و آداب یا کسی کے دستخط نہیں تھے۔ ان مین دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا۔

''ذاتی طور پر میرے دوست، میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اپنی طرف سے بہت مدت سے جو رکاوٹ درپیش ہے اسے دور کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھوں گا۔ قدرتی ہے کہ میں تم سے بات چیت کرنے کے لیے جس قدر وقت ممکن ہو سکے گا نکالوں گا۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی کانفرنس کی مدوں کی فہرست کے علاوہ اور بھی کام اس قدر زیادہ ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں بات چیت کے لیے پرسکون ماحول نہ مل سکے گا جس میں ہم لوگ مل جل کر وہ باتیں کسکیں جو میرے دل و دماغ میں ہیں۔ کیا میں ایک دوسرا ذریعہ بتا سکتا ہوں؟ دلی کی بیٹھک کے بعد تم اپنی سہولت سے وینا کے ساتھ پاکستان آؤ اور ہم لوگوں کے ساتھ چند دن رہو۔ اس طرح ہم لوگوں کے گھر کے لوگ ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بچوں سے ملو اور ان سے اچھی طرح واقف ہو جاؤ۔ میری سب سے بڑی لڑکی آجکل ریڈکلف میں ہے۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ بھی ہمارے پاس آجائے گی۔ ہم لوگ دو یا تین دن کے لیے کسی ایسے ہل اسٹیشن پر جا سکتے ہیں جس پر کشمیر میں تمہاری فوج نے قبضہ نہ کر رکھا ہو۔ ہمارے یہاں اب بھی کچھ خوبصورت مقامات ہیں لیکن میں ان کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ کہیں تمہاری ''ایکس پنشن'' (پھیلاؤ) کی بھوک میں اور اضافہ نہ ہو جائے۔ تم سے ملنے کی امید ہیں۔''

شملہ چوٹی کانفرنس کے تقریباً تین یا چار ہفتہ پہلے میں نے وزیراعظم کو ایک خط لکھا اور ان سے پوچھا کہ کیا ہند سرکار مجھے جناب بھٹو کے اعجاز میں استقبالیہ جلسہ کرنے کا موقع دے گی تاکہ میں ان سے اور ان کے کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات کرسکوں جو ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے ہوں گے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ چونکہ وزیراعظم ملک سے باہر جارہی ہیں۔ اس لیے شاید انہیں میرے خط کا جواب دینے کے لیے وقت نہ مل سکے۔ اس لیے میں اس خط کی ایک نقل سردار سورن سنگھ کے پاس بھی بھیج رہا ہوں۔ دو ہفتہ تک مجھے نہ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی طرف سے اور نہ سردار سورن سنگھ کا ٹیلی فون ملا۔ جس میں مجھے اطلاع دی گئی کہ چوٹی کانفرنس ممکن ہے شملہ میں ہو۔ جہاں میرے لیے جناب بھٹو کے اعزاز میں استقبالیہ جلسے کا اہتمام کرنا ممکن نہ وہ۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ میرا ارادہ شملہ میں ان کے اعزاز میں استقبالیہ جلسے کا اہتمام کرنے کا نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی خلاصہ کر دیا کہ میں نے یہ مشورہ اس لیے دیا تھا کہ میں دلی میں اپنے گھر میں ایک پارٹی کا اہتمام کرسکوں۔ اس کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ میں ان سے ملاقات کرسکوں؟ اس کے جواب میں مجھے اطلاع دی گئی کہ یہ اصرار صدر بھٹو کی طرف سے ہونا چاہیے۔ انہوں نے ایسا اصرار کیا تو سردار سورن سنگھ مجھے مطلع کر دیں گے۔ جب سردار سورن سنگھ برابر یہی اصرار کرتے رہے کہ تم سے ملاقات کی خواہش صدر بھٹو کی طرف سے ظاہر کی جانی چاہیے تو آخر میں میں نے ان سے کہہ دیا کہ اس سلسلے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ مسئلہ صرف ہند سرکار کے ساتھ ہے۔

چوڑی کانفرنس سے ایک دن پیشتر میں دلی پہنچ گیا اور میں نے فوراً سردار سورن سنگھ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے دریافت کیا پروگرام اس حد تک تیار ہو گیا کہ وہ مجھے یہ بتا سکیں کہ میں صدر بھٹو سے ملاقات کر پاؤں گا یا نہیں؟ مجھے بتایا گیا کہ وہ صدر بھٹو کو یہ بتا دیں گے کہ میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر صدر بھٹو مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں گے تو اس کی اطلاع دلی میں مجھے دے دی جائیگی اور میں ملاقات کے لیے شملہ آ سکتا ہوں۔

اس انتظام سے مجھے سخت پریشانی ہوئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہند سرکار یہ نہیں چاہتی کہ میں اپنے پرانے دوست سے ملاقات کروں۔ جب میں اس مسئلے پر غور کر رہا تھا تو مجھے میری دوست گوتم کھنہ نے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ اور رائے بہادر اوبیرائے دوسرے دن صبح شملہ جا رہے ہیں۔ کیا میں اور وینا ان کے ساتھ چلنا پسند کریں گے۔ میں نے بلا جھجک ان کی پیشکش قبول کر لی اور دوسرے دن ہم بذریعہ کار شملہ روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ تقریباً دن کے ساڑھے تین بجے شملہ پہنچ گئے۔ میں نے شملہ پہنچتے ہی سردار سورن سنگھ کے سیکریٹریٹ اس ٹیلی فون نمبر پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جو مجھے دیا گیا تھا۔ لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر میں نے ہما چل بھون فون کیا اور صدر بھٹو کے ملٹری سیکریٹریٹ کو بتایا کہ میں شملہ پہنچ گیا ہوں۔ ایسا محسوس ہوا کہ سردار سورن سنگھ نے ہیلی کاپٹر میں چندی گڑھ سے شملہ آتے ہوئے صدر بھٹو کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس لیے صدر بھٹو نے شملہ پہنچتے ہی ہند سرکار کے اسٹاف کے ایک شخص سے جو ہما چل بھن میں تعینات تھا۔ کہا کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ شاید وہ میرا پتہ نہیں لگا سکا۔ بہر حال صدر بھٹو نیا یک سکیورٹی افسر کے ساتھ مجھے اوبیرائے سسل سے لانے کے لیے کار بھیجی۔ جب میں وہاں نہیں ملا تو وہ اوبیرائے کلارکس گئے اور مجھے اطلاع دی کہ صدر بھٹو مجھے ہما چل بھون میں بلا رہے ہیں۔ میں اور وینا تقریباً ڈھائی گھنٹے تک بھٹو کے ساتھ رہے اور اپنے پرانے دنوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہم لوگوں نے گھر کے ہر ممبر کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کی اور حال چال معلوم کیے۔ اگلے دن صبح چوٹی کانفرنس ہونے والی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے پیغام ملا جس میں کہا گیا تھا کہ اس دن 11 بجے صبح صدر میرا انتظار کریں گے اور وہ چاہیں گے کہ ہم لوگ دوپہر کے کھانے تک ان کے ساتھ ہی رہیں۔ کھانے کا یہ پروگرام دن کے ساڑھے تین بجے تک چلتا رہا۔

چونکہ چوٹی کانفرنس کی بیٹھک ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا اور یہ بھی پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ سرکاری سطح پر بات چیت میں کیا ہو رہا ہے اس لیے تقریباً تین سو اخباری نمائندے بے حد بیقرار ہو اٹھے۔ وہ میرے پاس برابر آ رہے تھے تا کہ انہیں یہ پتہ لگ سکے کہ چوٹی کانفرنس میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ میں اس وقت تک تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے صدر پاکستان کے ساتھ گزار چکا تھا۔ میں اخباری نمائندوں کو برابر اپنے پاس سے دور رکھتا رہا کہ میں شملہ صرف اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے آیا ہوں اور یہ حقیقت بھی تھی۔ ہند سرکار اس بات کو بالکل نہیں چاہتی کہ میں یہاں ذرا بھی ٹھروں یا رکوں۔ میں کسی کے معاملے میں کوئی دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ میں جان بوجھ کر چوٹی کانفرنس کی بات چیت سے خود کو بالکل علیحدہ رکھ رہا ہوں۔

جو لوگ مجھے جانتے ہیں، انہوں نے میری بات پر یقین کر لیا۔ لیکن دوسرے لوگوں نے میری بات نہیں مانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افواہیں پھیلنے لگیں اور میرے اوپر دباؤ پڑتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے سوتنتر پارٹی کے صدر کی حیثیت سے ایک کانفرنس بلانی چاہیے اور چوٹی کانفرنس کے سلسلے میں اپنا رویہ صاف کر دینا چاہیے۔ اس پریس کانفرنس کا میری شملہ میں موجودگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر میں دلی میں ہوتا تو وہاں بھی پریس کانفرنس بلاتا۔ لیکن چونکہ میں شملہ میں تھا اور وہاں بہت سے اخباری نمائندے ٹھہرے ہوئے تھے اور چونکہ میں نے کئی گھنٹے صدر بھٹو کے ساتھ گزارے تھے۔ اس لیے ''ڈیوکو'' میں کی گئی پریس کانفرنس میں بہت سے اخباری نمائندے پہنچے۔ اس پریس کانفرنس میں میں نے

پاکستان کے سلسلے میں اپنی پارٹی کے رویے کا خلاصہ کیا اور دونوں ملکوں کے لیڈروں کی کانفرنس کا استقبال کیا۔ میں نے امید ظاہر کی کہ چوٹی کانفرنس سے پختہ اور دائمی امن کا راستہ استوار ہوگا اور دونوں ملکوں، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی قائم ہو سکے گی۔ یہی ایک ایسا ایک ایسا راستہ ہے جس سے جنوبی ایشیا کو بڑے ملکوں کی سیاست سے آزاد رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سچائی سے جس حد تک بھی ممکن ہو سکا میں نے سوالوں کے جواب دیئے۔

میری رائے تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات گہرے شکوک پر مبنی ہیں جو میرے خیال سے افسران دور نہیں کر سکتے کیونکہ وہ فائلوں کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔ جن فائلوں میں گزشتہ دسیوں برسوں سے ایک ہی طرح کے دلائل دیے گئے ہوتے ہیں۔ میرا یقین تھا کہ چوٹی کانفرنس کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ صدر بھٹو اور شریمتی گاندھی کئی گھنٹے آپس میں بات چیت کریں تا کہ وہ ایک دوسرے کو بخوبی جان سکیں اور جو پرانے شبہات ہیں وہ دور ہو سکیں۔ دراصل میں نے مشورہ دیا کہ ''دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے اور چابی پھینک دی جائے۔ یہ کمرہ اس وقت تک نہ کھولا جائے جب تک چمنی سے دھواں نہ نکلنے لگے۔ میرا مطلب پوپ کے انتخاب کے طریقے سے تھا''۔

لیکن میرے اس مشورے کو کچھ لوگوں نے غلط سمجھا اور جو لوگ اس کے مطلب کو سمجھتے تھے انہوں نے اور لوگوں کی غلط فہمی کا مزا لیا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ الہٰ آباد بار ایسوسی ایشن نے سوتنتر پارٹی کے ایک ممبر کو اپنے یہاں بلایا اور اس سے ڈیڑھ گھنٹے تک یہ جرح کی کہ ان الفاظ سے میرا کیا مقصد تھا۔ جب میں نے یہ کہا کہ دونوں لیڈروں کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے اور باہر سے تالا لگا دیا جائے۔

اس روز رات کو صدر بھٹو نے ہم لوگوں کو ڈنر پر بلایا۔ ہم لوگوں نے ان کے اور ان کی بیٹی بے نظیر کے ساتھ بڑے آرام سے تین گھنٹے گزارے۔ بے نظیر شریمتی گاندھی اور جناب بھٹو کے مقابلے کہیں زیادہ آرام سے شملہ میں وقت گزار رہی تھی۔ ادھر چوٹی کانفرنس آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

چوتھے دن میری طبیعت خراب ہوگئی۔ شاید میں نے اس دن کوئی ایسی چیز کھالی تھی جو میرے موافق نہیں آئی۔ اس لیے مُن نے سارا دن بستر میں ہی گزارا۔ خبر آئی کہ چوٹی کانفرنس میں بات چیت کچھ آگے بڑھی ہے۔ شریمتی گاندھی اور صدر بھٹو کی کئی مرتبہ ملاقات ہوئی ۔اس کی وجہ سے بھٹو اور ان کے ساتھی سارا دن مصروف رہے۔

آخری دن ایسا محسوس ہوا کہ چوٹی کانفرنس ناکام ہوگئی ہے اور کانفرنس کا کوئی نتیجہ نکل نہیں پائے گا جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ آخری دن صدر بھٹو نے الودعیہ ڈنر کا اہتمام کیا۔ جس میں میں اور وینا ہی دو ایسے غیر سرکاری لوگ تھے جنہیں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ ڈنر کے آخری لمحات میں شریمتی گاندھی اور صدر بھٹو اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سمجھوتے کے لیے ایک مرتبہ اور کوشش کریں گے۔

استقبالیہ ہال میں جلد ہی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ کبھی بھٹو اور ان کی پارٹی کے لوگ استقبالیہ ہال میں آپس میں صلاح مشورہ کرتے تو کبھی شریمتی گاندھی اور ان کی پارٹی کے لوگ بلیرڈ روم میں بات چیت کرتے۔ دونوں لیڈر ملتے اور پھر آگے صلاح مشورہ شروع کر دیتے۔ اس کے بعد افسران کی بات چیت ہوتی اور لیڈروں کی پھر ملاقات ہوتی۔ اس دوران اخباری نمائندے بھی ہما چل بھون پہنچ چکے تھے۔ انہیں ہال اور کمروں میں آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس سرگرمی کے دوران رسپشن ہال اور بلیرڈ روم کے دروازے کبھی کھلتے اور کبھی بند ہو جاتے۔

جب بلیرڈ روم کا دروازہ ایک بار کھلا تو ایک ایسا منظر سامنے تھا جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ بیسیوں فوٹو گرافر اور کیمرہ مین موجود تھے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی اس کبھی نہ مٹنے والے منظر کا فوٹو نہ لے پایا۔ جیسے ہی بلیرڈ روم کا دروازہ کھلا ہم نے دیکھا کہ شری جگ جیون رام بلیرڈ

روم ٹیبل پر بیٹھے ہوئے ہیں اور شریمتی گاندھی میز کے ایک ہرے حصے پر رکھے کاغذ پر کچھ کاٹ رہی ہیں۔ظاہر تھا کہ وہ سمجھوتے کے مسودے پر شری فخر الدین علی احمد سے بات چیت کر رہی تھیں اور ان کے اردگرد بہت سے افسر کھڑے ہوئے تھے۔یہ ایک بہت ہی شاندار فوٹو ہوتا اور اس منظر کو ہمیشہ یاد رکھنے میں مدد دیتا۔

آخر کار پونے گیارہ بجے رات کو آخری مسودے پر دونوں لیڈروں نیا پنی اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور یہ ضروری ہو گیا کہ سمجھوتے کا آخری مسودہ لکھ کر تیار کر لیا جائے۔یکا یک پتہ چلا کہ ہما چل بھون میں بجلی وٹائپ رائٹر نہیں ہے۔ٹائپ رائٹر لانے کے لیے لوگ فوراً ہی اوبیرائے کلارک ہوٹل بھاگے۔مہمان اور اخباری نمائندے وہاں برابر گھوم رہے تھے۔میں نے اس وقت کہا کہ شاید ایک یہی ایسا سمجھوتہ ہوگا جو اوبیرائے کلارک ہوٹل کے ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیا جائے گا۔ادھر پاکستانی نمائندوں کو یہ پتہ چلا کہ پاکستان سرکار کی مہر غلطی سے دیگر سامان کے ساتھ تیسرے پہر واپس بھیج دی گئی ہے۔اس لیے دونوں فریقوں نے طے کیا کہ وہ دستاویز پر سرکاری مہر نہیں لگائیں گے۔رسپشن ہال میں کئی ٹیلی فون تھے اور کوئی بھی سن سکتا تھا کہ فکر زدہ اخباری نمائندہ ہے چوٹی کانفرنس کے نتیجے کے بارے میں کس طرح تخیل کے سہارے اپنی اپنی کہانیاں گھڑ رہے تھے۔اسی شور شرابہ کے درماین میں نے ٹیلی فون پر ایک شخص کو بھاری آواز میں بے قراری سے یہ کہتے ہوئے سنا:''آل انڈیا ریڈیو اور فلم ڈویژن کے لوگ کہاں ہیں؟ دنیا بھر کے لوگ یہاں موجود ہیں۔وہ لوگ کہاں گئے؟ ان سے کہیے وہ فوراً یہاں آئیں''۔میں نے بعد میں پتہ نہیں کی اکہ آل انڈیا ریڈیو اور فلم ڈویژن کے لوگ وہاں پہنچے کہ نہیں۔ادھر سمجھوتے پر سرکاری طور پر دستخط کرنے کے لیے میز وغیرہ کا انتظام کیا جا رہا تھا۔میں نے دیکھا کہ دس افسر مل کر ایک ٹیبل کلاتھ کو میز پر بچھانے کی کوشش کر رہے تھے۔میں نے دیکھا ہر افسر ٹیبل کلاتھ کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔وہ سب مختلف سمتوں میں تھے۔کچھ دیر بعد تقریباً ایک درجن بڑے بڑے افسروں نے سارا انتظام کیا اور اس میز کا جس پر دستخط ہونے والے تھے بار ار معائنہ کیا۔انہوں نے قلموں اور دواتوں کو دیکھا جن کا استعمال دستخط ہونے کے وقت کیا جانے والا تھا۔لیکن عین موقعے پر دستخط ہونے کے وقت کیا جانے والا تھا۔لیکن عین موقعے پر دستخط کرنے والے قلم نے کام نہیں کیا اور کسی دوسرے کا قلم ادھار مانگنا پڑا۔

رات کے 12 بج کر 45 منٹ کے بعد سب لوگ دستخط کیے جانے والی کاروائی کے لیے تیار ہو گئے۔فلیش بلب چمکنے لگے اور سمجھوتے پر دستخط کے فوٹو کھینچے جانے لگے۔اس کے بعد صدر بھٹو نے شریمتی گاندھی کو کار پر بٹھا کر رخصت کیا اور مجھے اور وینا کو لینے کے لیے سیڑھیوں سے اوپر آئے تا کہ سمجھوتہ ہونے کی خوشی منائی جا سکے۔

سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ سمجھوتے کی اصلی کاپی پریس کو صبح ساڑھے نو بجے دی جائیگی۔

اخباری نمائندے سمجھوتے کی باتوں کی جاننے کے لیے بیقرار تھے۔میری رائے جاننے کے لیے سمجھوتے کی ایک نقل مجھے بھی دے دی گئی۔جیسا کہ میں نے طے کر لیا تھا۔میں چوٹی کانفرنس کے چکر میں نہیں پڑا۔میں نے سمجھوتے کے مسودے کی نقل پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اس مین پوشیدہ معنی سمجھنے کے لیے اسے دوبار پڑھا۔اس دفعہ الفاظ اور محاوروں کو میں نے ذہن نشین کر لیا۔اس کے بعد میں نے سمجھوتے پر کچھ اس طرح کی رائے زنی کی جو دونوں فریقوں کی تائید نہیں کرتی تھیں۔میں نے یہ کہہ کر ہی صبر کر لیا کہ مجھے کسی بھی طرح کا کوئی سمجھوتہ ہو جانے کی بے حد کوشی ہے۔مین نے امید ظاہر کی کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہونے کی بہترین شروعات ہے۔ادھر زلفی نے سمجھوتے کے متعلق اپنی بات چیت جاری رکھی۔اس کی مختلف دفعاؤں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ان کے دو خاص صلاح کار تھے۔رفیع رضا اور برکی۔عام طور پر یہ لوگ سمجھوتہ ہو جانے پر خوش نظر آ رہے تھے۔

اس موقعے پر یہ ضروری ہو گیا کہ سمجھوتے کی خبر فوراً لاہور کو دی جائے۔پاکستان نے سمجھوتے کی خبر دینے کے لیے اتنا وسیع اور زوردار

انتظام کیا تھا کہ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تین طرح کے انتظام کیے گئے تھے۔ خواہ چوٹی کانفرنس کامیاب ہو خواہ نہ ہو خبر تو بہر حال دینی ہی تھی۔ لاہور سے جو سیدھی لائن تھی، اس پر کسی کو یہ اطلاع دی گئی کہ پلان بی پر کاروائی شروع کر دی جائے۔ اس کے ساتھ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ پلان بی کی تیسری بات کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ لاہور میں جو شخص خبر موصول کر رہا تھا۔ وہ بے حد راحت محسوس کر رہا تھا۔ سمجھا جاتا ہے کہ خبر سن کر اس نے کہا تھا: ''اللہ کا شکر ہے کہ آخر آپ نے فون تو کیا''۔ کیونکہ اس نے پلان سی پر کاروائی کرنیکا انتظام کر رکھا تھا۔ اس طرح سے کام کرنے کی ہوشیاری ہر نظریہ سے قابل تعریف ہے۔ اس سے بھٹو اور اس کے ساتھیوں کی دور اندیشی نظر آتی ہے۔

آخر ہم لوگ رات ڈھائی بجے رخصت ہوئے اور اگلی صبح میں زلفی کو الوداع کہنے کے لیے ہیلی پیڈ پر گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ جنسی جلدی ہو سکا میں پاکستان آؤں گا۔

میں اسی روز دلی واپس آ گیا اور میں نے سوتنتر پارٹی کی طرف سے ایک بیان اخباروں کو دیا جس میں شملہ سمجھوتے کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔

ہند و پاک چوٹی کانفرنس نے ہچکچاتے ہوئے پہلا قدم اٹھایا ہے جو دائمی امن قام ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح کے اور بھی قدم اس سمت میں اٹھانے ہوں گے۔ لیکن کسی بھی حل کے لیے یہ بنیادی بات ہے کہ دونوں فریقوں کے وہ شبہات دور کیے جائیں جن کی وجہ سے گزشتہ 25 برسوں سے ہمارے تعلقات ناسازگار ہیں۔ صرف سمجھوتوں یا قراردادوں سے مسئلے حل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں فریقوں کا ایک دوسرے پر یقین و اعتماد ہو۔ ان میں دوستی ہو۔ تب ہی ہمارے دونوں ملک عظیم مستقبل کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں۔

اس چوٹی کانفرنس کے تجربہ سے یہ ثابت ہو جانا چاہیے کہ کسی بھی جنگ میں نہ کسی کو فتح حاصل ہوتی ہے نہ شکست۔ جیسا کہ ایمرسن نے کہا ہے: ''حقیقی اور دائمی فتح امن کی ہی ہوتی ہے۔''

اٹھارھواں باب

آگے کا سفر

ذوالفقار علی بھٹو کے پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے سے پیشتر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات دشمنی بھرے رویے پر مبنی تھے۔اس دشمنی اور مخالفت میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔آج بھی یہ تعلقات کوئی بھی شکل اختیار کر سکتے ہیں کیونکہ حالات کا بدتر ہونا اب بھی ممکن ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ دو برسوں کے رویوں کے مقابلے اب سدھار ہوا ہے۔چاروں طرف تشدد کو ختم کرنے کا سہرا بھٹو کے سر ہے۔

یہ خیال مغالطوں سے بھرپور سمجھا جا سکتا ہے۔کیونکہ بھٹو نے اپنے متعلق برسوں تک یہ پبلسٹی کی ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الجھنے کرنے کا زبردست حامی ہے۔یہ پبلسٹی کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ بھی کی گئی ہے۔

اقوام متحدہ میں اس نے ''ہندوستانی کتے'' لفظ کا جو استعمال اپنی تقریر میں کیا تھا وہ بہت ہی چوٹ پہنچانے والا تھا۔اس سے لوگوں میں جو غصہ اور ناراضگی پیدا ہوئی وہ قدرتی تھی۔بیشتر ہندوستانی اس کی اس بات پر غصے سے ابل پڑے تھے۔

ایسا شخص اگر میٹھی باتیں کرتا ہے اور امن کی امید دلاتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا اس شخص میں زمین اور آسمان کا فرق آ گیا ہے۔یہ تبدیلی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔لیکن اگر بھٹو کی بابت جانکاری ہو تو یہ تبدیلی قطعی حیرت آمیز نہیں ہے کیونکہ خیالات کے متعلق جو بھی باتیں وہ پیر پیٹ پیٹ کر اور ہاتھ نچا نچا کر کہتا ہے وہ سب کسی بھی کام کے آخری انجام یا نتیجے کے اصول پر مبنی ہوتی ہیں وہ مختلف طرح کے ''عزم'' سے خود کو دور رکھتا ہے اور جیسے ہی ان کی بات آتی ہے وہ کہنے لگتا ہے کہ یہ بات اس کی پکڑ سے دور ہے۔

جب الجیریا کی جنگ آزادی جاری تھی تو اس نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ ایک مثال ہے۔اس وقت یہ سوال اٹھا تھا کہ الجیریا کو تسلیم کیا جائے۔الجیریائی اس وقت فرانس سے لڑ رہے تھے۔بھٹو دل سے تو الجیریا کو تسلیم کیا جائے۔الجریا کی عوام کے ساتھ تھا۔لیکن اس کی سمجھ اسے روکے وہئے تھی۔وہ تین برس کے بعد ہی الجیریا کو اہمیت دے سکا۔فرانس سکیورٹی کونسل کا ممبر تھا اور اگر بھٹو الجیریائی باغیوں کو اہمیت دے کر فرانس کو اپنے خلاف کر لیتا تو فرانس کشمیر کے معاملے میں پاکستان کی مخالفت کر کے اس مخالفت کا جواب دے دیتا۔اس لیے ''مسلم اتحاد'' جیسی باتوں کی پرواہ کیے بغیر بھٹو نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے فرانس ناراض ہو جائے پاکستان کے مفاد دیگر تمام باتوں کے مقابلے میں بھٹو کو زیادہ عزیز اور اہم تھے۔یہ حقیقت ہے کہ بھٹو کی عملی اور دور اندیشی کی عادت نے ہی راتوں رات اسے ہندوستا کے متعلق جنگ کا حامی ہونے کی جگہ امن کا فرشتہ بنا دیا۔

ابھی حال ہی مین بمبئی کے ایک ہفتہ وار ''بلٹز'' کے ایڈیٹر نے اپنے ایک انٹرویو میں صدر پاکستان سے پوچھا کہ آپ ایک دوسرے کے مخالف دو بنیادی باتیں کہتے ہیں۔ایک طرف تو آپ شعلہ فشاں سیاست دان کی حیثیت سے مشہور ہیں اور دوسری طرف امن کے خواہاں صدر کے نام سے مشہور ہونا چاہتے ہیں۔آپ کی ان دونوں باتوں کو کس طرح ایک دوسرے سے جوڑا جا سکتا ہے؟ واضح رہے کہ ''بلٹز'' بھٹو، اس کے اصولوں اور پالیسیوں کا زبردست مخالف رہا ہے۔

بھٹو نے کھلے الفاظ میں کہا کہ ''ان دونوں باتوں میں ایک دوسرے کے لیے ہرگز اختلاف نہیں ہے کیونکہ میں تو گزرتے ہوئے حالات کا غلام ہوں۔'' بھٹو نے اپنے بیان کا خلاصہ اس طرح کیا۔''ایک وقت تھا جب پاکستان کے حق میں وہ طاقتیں تھیں جو ہتھیاروں کی طاقت کو سب سے بڑی طاقت مانتی ہیں۔اس کا نتیجہ تھا کہ 1962ء میں ہمیں امریکہ سے زبردست فوجی امداد حاصل ہوئی۔

''شاید اس کے لیے آپ ہماری تنقید کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر میں ایوب کی جگہ ہوتا تو اس موقعے کا پورا فائدہ اٹھاتا۔ میں ہمیشہ موقعوں کا فائدہ اٹھانیکے حق میں ہوں۔ میں 1962ء کی حالت کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اب حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں اور میں ان حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

دوسرے الفاظ میں بھٹو نے یہ خلاصہ کر دیا کہ 1962ء میں ہندوستان کے متعلق اس کے ارادے اور نظریئے کچھ بھی رہے ہوں، موجودہ حالت میں جبکہ پاکستان کو منہ کی کھانی پڑی ہے اور وہ اپنے پورے مشرقی حصے سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، اس کے خیالات تبدیل ہو گئے ہیں۔

سیاست کے متعلق ٹھیک ہی کہا گیا ہے کہ یہ فن امکانات ہے۔ آج بھٹو نے اسے اپنے ملک میں سب سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ لیڈر کی حیثیت سے اسے کئی مرتبہ ناامیدیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ لیکن وہ اپنی طاقت کو جانتا تھا اس لیے وہ کبھی اس طرح کے اکھاڑے میں نہیں کودا جس میں اسے اپنی فتح کا کم از کم پچاس فیصد یقین نہ تھا۔ یہی خاص وجہ ہے کہ بھٹو کو اپنے ملک کا صدر بننے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ جب بنگلہ دیش میں حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی اس وقت اگر یحیٰی خان کے بجائے بھٹو پاکستان کا صدر ہوتا تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کو ٹالا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی وجہ نہ بھی ملتی تو بھی بھٹو حالات کے تقاضے کی وجہ سے جھگڑا مول نہ لیتا۔

جب ''بلٹز'' کے ایڈیٹر نے یہ دریافت کیا کہ کیا موجودہ حالت میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جنگ چھیڑنے کی طاقت ہے؟ بھٹو نے جواب دیا کہ ''موجودہ تعلقات دراصل جدوجہد کا ہی نتیجہ ہیں۔ آپ نے مشرقی پاکستان میں دخل اندازی کی۔ آپ نے ہتھیار اور فوج استعمال کی اور جنگ چھیڑی۔ میری جدوجہد تھی اسے میں نے عملی شکل نہیں دی۔ آپ نے ایسا کیا کہ مسئلہ پیدا ہو گیا۔''

جب انٹرویو کرنے والے ''بلٹز'' کے ایڈیٹر نے کہا کہ ''ہندوستان کو بنگلہ دیش کے جھگڑے میں کچھ ایسی طاقتوں نے دھکیل دیا تھا جو ہمارے قابو میں نہیں تھیں اور یہ کام آپ کی طرف سے ہوا''۔ اس پر بھٹو نے صاف الفاظ میں اس بات سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اسے کوئی بھی زبردستی کسی معاملے میں نہیں دھکیل سکتا''۔

لیکن فسفیانہ انداز میں سوچتے ہوئے بھٹو نے بنگلہ دیش کے معاملے میں ہندوستان کی کاروائی کو عقلمندی بتایا اور کہا کہ ''جو بھی ہو فیصلہ جدوجہد کے ذریعے ہی ہوا اور جدوجہد کی پالیسی کی مناسبت بھی ثابت ہو گئی۔ شاید اس سے ہندوستان کو ہی فائدہ ہوا۔''

یحیٰی خان کی بیوقوفی کی وجہ سے پاکستان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس بات کو بھٹو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مکمل فتح کے باوجود ہندوستان انصاف اور سمجھداری کی بناء پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو جھگڑے ہیں انہیں فوراً حل کیوں نہیں کرتا۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں یہ تین اہم مسئلے ہی جھگڑا طلب ہیں۔

(۱) کشمیر جھگڑے کا حل

(۲) پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا اور

(۳) ہندوستان میں رکھے گئے جنگی قیدیوں کی واپسی۔

کشمیر کے معاملے میں دونوں ملکوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے اس لیے اس کا خلاصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے بہت رخ تبدیل ہو جانے کے علاوہ اس معاملے میں دونوں فریق پالیسی میں بہت زیادہ تبدیلی کر پانے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔

ہندوستان، پاکستان میں سے کون سا ملک پہلے اعلان کرے گا کہ یہ مسئلہ تقسیم کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے کیونکہ تقسیم منظور کرانے کے لیے اس کڑوی گولی پر کافی چاشنی چڑھانی ہوگی۔ اس کتاب میں ایک جگہ میں نے ایک حل بتایا ہے۔ دوسرے حل بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے مرد، عورتوں کی ضرورت ہے جن میں بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ہمت ہو۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بھٹو نے ''بلٹز'' کے ایڈیٹر آر۔ کے کرنجیا کو انٹرویو دیا جبکہ یہ اخبار اور اس کے ایڈیٹر مسلسل بھٹو کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

اس انٹرویو کی اہمیت اس بات پر نہیں ہے کہ بھٹو نے کیا بیان دیئے بلکہ اس میں ہے کہ کرنجیا نے بھٹو کے رخ کا کیا جائزہ لیا۔

کافی مدت سے اور دراصل انٹرویو کے وقت تک کرنجیا کی نظر میں بھٹو ایک جنگ پسند انسان ہے اور وہ اتنی جلدی جلدی رنگ تبدیل کرتا ہے کہ اس پر ذرا بھی یقین نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری طرف کرنجیا نے شیخ مجیب الرحمٰن کو فرشتہ مان کر ان کی پرستش کی ہے۔ بھٹو اور مجیب کا بخوبی مطالعہ کرنے کے بعد کرنجیا اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ بھٹو زمہ دار اور ذہین ہے اور مجیب کا رویہ ایک ضدی اور اڑیل شخص کا ہے۔

گزشتہ برس تک جس طرح ہندوستان میں شیخ مجیب کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے تھے اور بھٹو کو بدنام کیا جاتا تھا، اس سے کوئی بھی شخص یہ امید نہیں کرسکتا تھا کہ ہندوستانی عوام اتنی جلدی اپنا متعصبانہ نظریہ تبدیل کر کے بھٹو اور مجیب کو یکساں ماننے لگے گی۔

پھر بھی اگر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو ایمانداری سے اور زیادہ عملی اور دوستانہ بنانا ہے تو یہ بہت ضروری ہے کہ ہم وقت کے تقاضے کے مطابق ٹھوس، حقیقی اور غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کریں۔ انہیں پچھلی باتوں کو صاف کرنے کے لیے میں اس انٹرویو کے چند حصے یہاں پیش کر رہا ہوں جو آر۔ کے کرنجیا کو ذوالفقار علی بھٹو نے دیا اور جس کی رپورٹ ''بلٹز'' کے 16 اور 24 ستمبر 1972ء کے پرچوں میں شائع ہوئی ہے۔

کرنجیا نے کہا ہے کہ بنگلہ چیس کو تسلیم کرنا۔۔۔۔۔۔۔۔اور جنگی قیدیوں کی واپس جھگڑے کے ان دو امور کی وجہ سے جو رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے، بھٹو اسے دور کر دینا چاہتے ہیں اور وہ اس وقت تک بات چیت جاری رکھنے کے لیے تیار ہیں جب تک کہ یہ دونوں مسئلے حل نہیں ہو جاتے۔

کرنجیا نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ بھٹو نے اس بات پر برابر زور دیا کہ وہ شیخ مجیب سے کسی بھی وقت اور کسی بھی مقام پر ملاقات کرنیکے لیے تیار ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنی سہولت اور کو داری کو رکاوٹ نہیں بننے دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی کرنجیا کو بھٹو نے یہ یقین بھی دلایا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ تو بات چیت سے ہی حل ہوسکتا ہے اور وہ مجیب سے بات چیت کرنیکے لیے تیار ہیں۔

جیسا کہ کرنجیا نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ بھٹو نے اس بات کا یقین بھی دلایا کہ بات چیت کا نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے لیکن ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیں گے۔ بات چیت کی کامیابی یا ناکامی پر یہ بات منحصر نہیں ہے۔ بنگلہ دیش پاکستان کی باہمی تعلقات رکھنے کی خواہش کو بھلے ہی ٹھکرادے۔ لیکن مجیب سے جب بھی اور جہاں بھی ملاقات ہو جائیگی ہم بنگلہ دیش کو ایک آزاد ملک کی حیثیت میں تسلیم کرلیں گے۔

جب کرنجیا نے یہ کہا کہ چین اقوام متحدہ میں بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے سوال پر ویٹو استعمال کر کے دشواری پیدا کرسکتا ہے تو بھٹو نے یقین دلایا کہ ''اس معاملے میں چین اور پاکستان کے درمیان کسی طرح کی سازش یا بنگلہ دیش کے خلاف کوئی سمجھوتا نہیں ہے۔ ہم بنگلہ چیش کو جب بھی چاہیں تسلیم کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ اس معاملے میں ہمیں کسی کے حکم کی ضرورت نہیں ہے۔''

جہاں تک مجیب سے ملاقات ہونے میں عجلت کا سوال ہے۔ بھٹو نے کھلے الفاظ میں یہ ثابت کر دیا کہ اس کے لیے وہ قطعی ذمہ دار نہیں

ہے۔اس نے کہا کہ پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا سوال پاکستان نیشنل اسمبلی میں لے جاؤں گا اور اس سوال پر ستمبر 1972ء تک اسمبلی کی تائید حاصل کرلوں گا۔ میں نے یہ بات صرف شریمتی گاندھی کو ہی نہیں بلکہ ترکی کے اپنے دوستوں کو بھی بتائی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ مجھے امید ہے کہ کسی بھی وقت مجیب سے ملاقات ہو سکے گی۔

کرنجیا نے اپنے انٹرویو میں بھٹو کے اس بیان کا اس طرح حوالہ دیا ہے:

''خود مجیب نے رہائی سے پہلے مجھے یہ یقین دلایا تھا۔ میں نے ان سے 27 دسمبر کو اور پھر 7 جنوری کو ملاقات کی تھی۔ انہوں نے اپنی ہی مرضی سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے پھر ملیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ ملاقات ان کے واپس جانے کے فوراً بعد ہو۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پہلے اپنے دیش میں اپنے پیر مضبوط کروں گا۔ اس کے بعد میری پہلی خواہش یہی ہوگی کہ میں لندن آؤں اور آپ سے (بھٹو سے) ملاقات کروں۔

''میں نے مجیب کو یہاں سے ٹیلی فون کر کے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ انہوں نے مجھے 27 دسمبر اور 7 جنوری کو بار بار یہ یقین دلایا تھا کہ ہم لوگ ضرور ملیں اور شروعاتی مسائل حل کرنے کے بعد دیگر قدم اٹھائیں۔''

''اب شاید انہیں اپنی اس بات کی تردید مناسب نظر آئے لیکن میں آپ کو یہاں تک بتا سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بار بار دلایا تھا اور جیب سے قرآن نکال کر اور اس پر ہاتھ رکھ کر ٹھیک یہی باتیں کہی تھیں جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں''

جب کرنجیا نے بھتو سے پوچھا کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ نے مجیب پر دباؤ ڈال کر یہ وعدے لے لیے ہوں۔ کیا وہ اس وقت آزاد تھے یا قیدی تھے؟ بھٹو نے جواب دیا کہ ''میں ان سے کہہ دیا تھا کہ میں انہیں رہا کر رہا ہوں اور میں نے انہیں سزائے موت سے بچالیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کے پاس کوئی ایسی وجہ تھی جس سے کہ وہ میری باتوں پر کچھ شک کرتے اور یہ سوچتے کہ میں ان کو رہا کرنے نہیں جا رہا۔ اس لیے وہ کسی بھی دباؤ میں نہیں تھے اور مان لیجئے کہ وہ دباؤ میں بھی تھے تو انہیں قرآن کی قسم کھانے کی کیا ضرورت تھی؟''

بھٹو نے آگے یہ خلاصہ کیا کہ انہوں نے یہ پلان بنایا تھا کہ عوام کی رائے اس کے حق میں تیار کرنے کے بعد وہ اس مسئلہ کے سوال کو پاکستان نیشنل اسمبلی کے سامنے پیش کریں گے اور وہاں اس ریزولیوشن کے پاس ہوجانے کے بعد بنگلہ دیش کو اقوام متحدہ میں داخل کرانے کے لیے مشترکہ طور پر کوشش کریں گے۔

لیکن جب مجیب نے بھٹو کے نیک جذبات اور یقین کو ٹھکرا دیا تو بھٹو کے دل میں تلخی پیدا ہونا لازمی تھا۔ ادھر مجیب مسلسل اسی بات کو دوہرائے جا رہے تھے کہ پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جائے اس کے بعد ہی کوئی بات چیت ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ بھٹو نے خلاصہ کیا کہ کسی بھی طرح کے سمجھوتے کے لیے پاکستان کے عوام کی تائید اور منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ اگر وہ اپنی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بارے میں کوئی یک طرفہ فیصلہ کر لیتا تو پاکستان میں اس کے مخالفین کے ہاتھوں میں اسے مارنے کے لیے ایک ہتھیار آجاتا۔

جیسا کہ بھٹو نے کرنجیا کو بتایا تھا۔

''ہم لوگوں نے پہلے یہ امید کی تھی کہ پہلے مجیب سے ملاقات ہوگی اور پھر ہم سلسلہ وار سارے کام پورے کریں گے۔ اس وقت میں عوام کو اس بات پر رضامند کرنیکے لیے تین ہفتے یا ایک مہینے کا وقت چاہتا تھا کیونکہ دوسرے لیڈر یا تو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنیکے قطعی طور پر خلاف تھے یا وہ اس کی مخالفت صرف اس لیے کر رہے تھے کہ وہ میری مخالف پارٹی کے ہیں۔ وہ لوگوں کے جذبات ابھارنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا

کہنا تھا کہ بنگلہ دیش کے وجود کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ حملہ آوروں کو حملے کا فائدہ دے دیا جائے یا پھر وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر ہندوستان پاکستان کا ایک حصہ اس طرح نگل سکتا ہے تو دوسرا حصہ بھی ہڑپ کر جائے گا یا پھر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے معنی دو نیشن کی تھیوری کو ٹھکرا دینا ہوگا۔ میں اس حالت میں نہ تھا کہ میں لوگوں کے پاس جاتا اور اس پروپیگنڈہ کی تردید کرتا۔ مین بہت مصروف تھا اور مجیب سے ملاقات کر پانے سے مجبور تھا۔''

اگر ان سے میری ملاقات ہو جاتی تو ملاقات کے بعد میں لوگوں کو سمجھاتا کہ دیکھو ہم نے سمجھوتے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ دو نیشن کی تھیوری کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں ہندوستان باقی پاکستان کو نگل جائے گا۔ اس طرح میں تمام ملک کی تائید حاصل کر لیتا۔''

لوگوں کے دلوں کے شکوک رفع کرنے کے لیے بھٹو نے کھلے الفاظ میں کرنجیا سے کہا:

''ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے جا رہے ہیں۔ ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر بات چیت درمیان میں ہی ٹوٹ جائے گی تو ہم بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کریں گے۔ بات چیت کا جو بھی نتیجہ نکلے ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کریں گے یہ ہم طے کر چکے تھے۔''

اس بات کو صاف کرتے ہوئے بھٹو نے کہا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا ہم نے جو وعدہ کیا ہے۔ ہم اس پر آج بھی قائم ہیں۔ حالانکہ اس سلسلے میں کچھ دیر ہوئی ہے۔ بھٹو نے یہ مشورہ دیا کہ اگر ہندوستان اپنے اثر کا استعمال کر کے مجیب کے ساتھ میری ملاقات کرا دے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اس سے مجیب کی شان کو بھی بٹہ نہیں لگے گا۔

شان کو بٹہ لگنے کے سلسلے مین بھٹو نے اپنی بات صاف کی:

''میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجیب اپنی شان میں بٹہ لگنے کے سوال پر بہت ہی چاق و چوبند ہیں۔ اس وقت بھی جب میں نے ان سے ٹیلی فون پر بات کی تھی وہ اپنی شان کے متعلق کہہ رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ ان کی شان برقرار رکھنے کے لیے ہمیں کوئی راستہ ضرور نکالنا چاہیے۔ اس سے اگر میری عزت میں کوئی بٹہ لگے تو میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن ہمیں کوئی راستہ ضرور نکالنا چاہیے۔ راستہ نکل آنے پر ہم دوسری چوٹی کانفرنس کر کے کسی نہ کسی فائدہ مند نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

''پھر بھی اگر یہ چوٹی کانفرنس کے خاکہ کے تحت ممکن نہ ہو تو شریمتی گاندھی کسی بھی وقت پاکستان تشریف لا سکتی ہیں۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ وہ یہاں آئیں اور خود اس ملک کو دیکھیں۔''

دوسرا جو اہم سوال ہے اور جو ہندوستان اور پاکستان کے درمایں کا نٹا بنا ہوا ہے وہ جنگی قیدیوں کا۔ ہندوستان کے نظریئے سے پاکستانی فوج نے مشرقی پاکستان میں ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کی مشترکہ کمان کے آگے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس لیے بنگلہ دیش کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جنگی قیدیوں کی رہائی کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

بھٹو کے مطابق ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کی مشترکہ کمان محض تخیل ہے۔ اس معاملے میں بھٹو کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش کی فوج نے مشرقی پاکستان میں جنگ کے خاتمے پر جنگ میں جو حصہ لیا وہ بہت ہی معمولی سا تھا۔ اگر ہندوستانی فوج اس جنگ میں پوری طرح شامل نہ ہوئی ہوتی تو یقیناً اس کا نتیجہ اس کے خلاف ہی نکلتا۔

بال کی کھال نکالے بغیر یا قانونی بحث کیے بغیر بھٹو نے فوراً خاص مدعا پر اپنی رائے ظاہر کرنی شروع کر دی اور کہا کہ ''میں یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جن پاکستان فوجیوں کے خلاف یہ الزام ثابت ہو جائے گا کہ انہوں نے واقعی ظلم کیے ہیں۔ انہیں مناسب سزا دی جائیگی۔''

بھٹو نے اپنی بات کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جنگ کے الزامات کے سلسلے میں مقدمہ چلانے سے اس کے مسئلے اور بھی پیچیدہ ہو جائیں گے اور جہاں تک مسلح فوج کا سوال ہے ایسی حالت بھی پیدا ہو سکتی ہے، جب اس کا حل کرنا ناممکن ہو جائے''۔ بھٹو نے درمیانی راستے کا مشورہ پیش کیا اور کہا کہ ''اگر زیادتیاں ہوئی ہیں یا جرم ہوئے ہیں تو میں پاکستان میں فوجی عدالت میں مجرموں کے خلاف مقدمہ چلانے کے لیے تیار ہوں''۔

بھٹو نے یہ بھی کہا کہ اگر مجیب چاہیں تو مجھے ان فوجیوں کی فہرست دے سکتے ہیں جنہوں نے جنگ کے دوران جرم کیے ہوں، اس فہرست کے ساتھ وہ مجھے ان کے جرم کے خلاف ثبوت بھی بھیج سکتے ہیں۔ بھٹو نے یقین دلایا کہ میں فوجی عدالت مقرر کر دوں گا اور اس بات کا پورا خیال رکھوں گا کہ انصاف کیا جائے۔

دوسری طرف بھٹو کو اس بات کا پورا شک تھا کہ اگر مقدمہ بنگلہ دیش میں چلایا گیا تو وہاں کی عدالت منصفانہ نظریئے اور قانونی طریقے سے مقدمے کی شنوائی کرے گی۔ بھٹو نے صاف لفظوں میں کہا کہ اگر یہ مقدمے ڈھاکہ میں چلائے گئے تو یہ ایک بہت بڑا تماشہ بن جائیں گے اور اس سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بھی بگڑ جائیں گے۔

جب کرنجیا نے کہا کہ ہندوستان کی طرح بنگلہ دیش بھی جنگی قیدیوں کے معاملے سے وابستہ ہے تو بھٹو نے جواب دیا:

''ٹھیک ہے۔ مان لیجئے آپ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ مجیب کی منظوری ضروری ہے۔ حالانکہ میں نہیں سمجھتا کہ کیوں ضروری ہے۔ خیر۔ مجیب کے پاس چند ہزار سے زیادہ ان قیدیوں کی فہرست ہے جن پر وہ مقدمہ چلانا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ باقی جنگی قیدیوں کو رہا کیوں نہیں کر دیتے؟''

''مجیب کو خوش کرنے کیلیے جتنے جنگی قیدیوں کی فہرست ان کے پاس ہے ان سے زیادہ جنگی قیدی اپنے یہاں قید رکھیں۔ اگر وہ پانچ ہزار کہتے ہیں تو آپ دس ہزار رکھ لیجئے۔ لیکن تمام جنگی قیدیوں کو روکے رکھنے کی کیا تک ہے اور جن میں سے بہت سے بے گناہ غیر فوجی بھی ہیں۔ آپ کے کیمپوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی ان تمام جنگی قیدیوں کو اپنے یہاں رکھنے کے بیہودہ پن کو محسوس کریں''۔

اس معاملے میں بھٹو اس سے زیادہ صاف رویہ کیا اختیار کر سکتا ہے۔ پھر خواہ کوئی مجیب کی کتنی بھی تعریف کرے یا بنگلہ دیش کے لوگوں پر جو مصیبتیں گزری ہیں ان کے ساتھ کتنی بھی ہمدردی رکھے لیکن مجیب جس طرح پچھلی غلطیوں کو بار بار ہرا رہے ہیں اور حالات ساز گار نہیں ہونے دے رہے۔ یہ کہاں تک جائز ہے یہ ثابت کرنا مشکل ہے۔

اس معاملے میں بھٹو کی ایمانداری کو کرنجیا نے تسلیم کیا ہے۔ انٹرویو کا لب لباب پیش کرتے ہوئے کرنجیا نے کہا ہے کہ ''جہاں تک یحییٰ خان اور ایوب خان کا سوال تھا مجب کا ان پر غصہ کرنا قطعی مناسب اور جائز تھا لیکن بھٹو پر اس طرح کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا''۔

جیسا کہ کرنجیا نے لکھا ہے۔

جناب بھٹو پچھلی غلطیوں کو سدھارنے کو پوری طرح خواہاں ہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جنگی قیدیوں پر مقدمہ بنگلہ دیش میں نہ چلایا جائے۔ کیونکہ جنگ کے دوران جو بھی جرائم ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری فوجی حکومت اور اس کے لیڈروں پر ہے فوجی افسروں اور سپاہیوں نے تو ان کا حکم بجایا ہے۔

جناب بھٹو پاکستان کے گرد و غبار سے پر ماضی سے جس طرح بھی وابستہ رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے دو مرتبہ نہیں تو کم

ازکم ایک مرتبہ تو یقینی طور پر شیخ مجیب کو پھانسی کے تختے سے بچایا ہی ہے۔اگر، اگر تلہ کیس کو بھی شامل کرلیا جائے تو اسے دومرتبہ ہی کہا جائیگا۔

انٹرویو میں آگے چل کر کرنجیا نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات کے درمیان آجانے والی رکاوٹ کا سارا الزام مجیب کے سر تھوپ دیا ہے۔کرنجیا نے مجیب پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کیے جانے کی شرط لگا کر بات چیت اور کسی بھی طرح کے سمجھوتے کا دروازہ بند کردیا ہے۔انہوں نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ بھٹو نے جو فارمولہ پیش کیا ہے اس سے مجیب کی شان میں بٹہ لگنے کے خطرے اور ضد کی وجہ سے جو بھی رکاوٹیں ہیں وہ سب دور ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک جنگی قیدیوں کا سوال ہے بھٹو نے اس پیشکش کے ساتھ کہ ہندوستان ان ملزم جنگی قیدیوں کے علاوہ اور بھی جنگی قیدیوں کے اپنے یہاں روک سکتا ہے جن پر کہ شیخ مجیب مقدمہ چلانا چاہتے ہیں۔کافی نرمی کا ثبوت دیا ہے۔بھٹو کا کہنا ہے کہ ہندوستان کو باقی جنگی قیدی رہا کردینے چاہئیں۔کرنجیا نے اس بات پر حیرانی ظاہر کی ہے کہ اس مناسب اور جائز مشورے کو منظور کرنے میں ڈھاکہ یا نئی دہلی کو کیا وقت پیش آرہی ہے۔

اپنے انٹرویو کے دوران کرنجیا نے کچھ ایسی باتیں بھی ظاہر کی ہیں جنہیں بیشتر ہندوستانی اخبار دیدہ ودانستہ طور پر چھپاتے رہے ہیں۔

سچائی یہ ہے کہ صرف پاکستانی فوجیوں نے ہی ظلم نہیں کیے بلکہ بنگلہ دیش والے بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس کام کی ابتدا ایسٹ بنگال رائفلز کے سپاہیوں نے کی۔

جیسا کہ کرنجیا نے لکھا ہے۔

''مجھے اندیشہ ہے کہ جنگی قیدیوں کے قیدیوں کے مقدمے کا بنگلہ چیش کے مفاد پر غلط اثر پڑے گا کیونکہ کوئی بھی چالاک وکیل ججوں کے دماغ میں یہ شک پیدا کرسکتا ہے اور یہ دلیل پیش کرکے مقدمے کو الجھا سکتا ہے کہ قتل کی وارداتیں حقیقت میں ایسٹ بنگال رائفلز کے سپاہیوں نے شروع کی تھیں۔ان لوگوں نے 26 مارچ 1971ء کی رات کو کئی مغربی پاکستانی افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

''اس بات کے ثبوت ہیں اور الزام ثابت کرنے کے لیے فوٹو گرام بھی ہیں یہاں تک کہ فوٹو اور فلمیں بھی ہیں۔جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن بہاریوں پر پاکستان کے ساتھ ملے ہونے کا شک تھا ان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں ٹائیگر صدیقی اور اس کے چھاپہ مار ساتھیوں نے بے رحمی سے کاٹ ڈالا تھا۔

''یہ حقیقت جو کافی عرصہ کے بعد سامنے آئی ہے۔اس کے عوض میں پاکستانی فوجیوں نے مشرقی بنگال میں عوام پر جو ظلم دھائے ان کے لیے ان کو معاف نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ظلم بغیر سوچے سمجھے بے رحمی کی وجہ سے کیے گئے تھے۔

''جس وقت ایسٹ بنگال رائفلز کے سپاہیوں نے قتل عام کیا پاکستانی فوج کی یونٹیں کم تعداد میں تھیں۔اس کے بعد پاکستانی فوجیوں نے جس بربریت کا ثبوت دیا اسے انتقام ہی کہا جاسکتا ہے۔یہ انتقام خواہ کتنا ہی بربریت، حیوانیت اور دیوانگی سے بھرا ہوا کیوں نہ ہو لیکن تھا انتقام ہی۔ان تمام حادثات کی تہ میں انتقام کا جذبہ ہی تھا۔''

کرنجیا کا یہ کہنا کہ ظلم بنگلہ دیش والوں نے بھی کیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ خود بلٹنر نے پہلے اس طرح کی خبروں کو من گھڑت بتایا تھا اور کہا تھا کہ ٹائیگر صدیقی اور اس کے ساتھیوں کے ظلم کرتے ہوئے جو فوٹو گراف ہیں وہ جعلی ہیں۔

لیکن مجیب کے زبردست حامی ''بلٹنر'' کا اب کھلے عام یہ کہنا۔۔۔۔۔کہ بنگلہ دیش والوں نے بھی ظلم کیے تھے۔۔۔مجیب کو آگاہ کرنے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔شیخ مجیب کو چاہیے کہ وہ پچھلی شکایتوں کو بار بار نہ دہرائیں۔یہ کہیں زیادہ عملی اور کارگر ہوگا کہ وہ گزری ہوئی

باتوں بھول جائیں اور ایک دور اندیش سیاست داں کی طرح اپنے ملک کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے عملی اور ٹھوس کام کریں جس طرح بھٹو نے کیے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے بنگلہ دیش کے سلسلے میں اس نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ آج بھی وہ کروروں روپیہ جو ہندوستان کے ترقیاتی کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے، غیر ضروری طور پر بنگلہ دیش کو دینا پڑ رہا ہے کیونکہ مجیب کے اڑیل رویے کی وجہ سے تینوں ملکوں کے درمیان جو مسائل ہیں حل نہیں ہو پا رہے۔

تاریخی حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے ہندوستان کے لیے بنگلہ دیش کی طرفداری کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اب وہ حالات نہیں ہیں۔ اب جتنی بھی جلدی ہندوستان بنگلہ دیش کے محافظ کا رول ادا کرنا بند کر دے اور اسے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کا موقع دے اتنا ہی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لیے بہتر ہوگا۔

جہاں تک بھٹو کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ نیا باب شروع کرنے کے لیے بہت ہی بے قرار اور خواہاں ہے۔ وہ گنہگاروں کو سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی بھلا دینے کے لیے تیار ہے کہ اس کا اپنا ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ کسی بھی شخص سے امید کرنا نا مناسب ہوگا۔ خاص طور سے ایسے شخص سے جو اپنے ملک کی قسمت سنوارنے میں مصروف ہو۔ جس طرح اس وقت بھٹو مصروف ہے۔

ایک طرف تو بھٹو اپنی شان میں بٹہ لگنے کے زبردست خطرے کی پروا نہ کر کے مجیب کو رعایتیں دینے کے لیے تیار ہیں اور دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن کا رویہ دور اندیشی سے دور رویہ ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ بنگلہ دیش نے زبردست نقصان نہیں اٹھایا یا تکلیفیں اور دکھ برداشت نہیں کیے۔ لیکن مسلسل ان تلخ گزری ہوئی باتوں کو یاد کرتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اس سے تو مستقبل میں سدھار ہونے کی امید کے راستے میں زبردست دشواریاں پیدا ہوں گی۔

اگر مجیب اپنے متعلق دنیا کے دل میں ہمدردی اور خلوص کا جذبہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں جو انہیں دینا سے آج بھی بہت زیادہ حاصل ہے تو انہیں اپنی ضد چھوڑنی ہوگی اور یہ کام جلد ہی کرنا پڑے گا۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ بھٹو سے بات چیت کرنے کی بجائے مجیب کے ساتھ چوٹی کانفرنس کا اہتمام کرے۔ ہم کو مجیب سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ بس اب بہت ہو چکا، اگر وہ ہندوستان پاکستان سمجھوتے کے لیے ضروری ماحول تیار کرنے میں تعاون نہیں کرتے تو ان کی پروا کیے بغیر ہند پاکستان سے سمجھوتے کی سمت آگے بڑھ جائیگا۔

انیسواں باب

کیا بھٹو اپنے عہدے پر دہ سکے گا؟

جب سے بھٹو نے صدر کا عہدہ سنبھالا ہے تب سے مسلسل یہ وال کیا جاتا رہا ہے کہ کیا ذوالفقار علی بھٹو اپنے عہدے پر رہ سکے گا؟ پاکستان میں جو تشدد پھیلا ہوا ہے، اگر سطحی نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو ایک دوسرے کے مخالف جو باتیں بنیادی طور پر موجد ہیں۔ ان سے ان اندیشوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بھٹو بہت ہی منجھا ہوا سیاست داں ہے۔ اس میں اپنے مخالفین سے نپٹنے کی صلاحیت ہے۔ اسے حکومت سے ہٹا دیئے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اسے ہٹانے والا اس کے مقابلے یا سیاسی معیار کا کوئی شخص پاکستان میں نہیں ہے۔ نہ کسی کو اس قدر مقبولیت حاصل ہے اور نہ کوئی اس قدر لائق ہے کہ اس کا مقام لے سکے۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ بھٹو صدر کیوں ہے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ وہ وجوہات کیا تھیں جن کی وجہ سے بھٹو کو یہ سب سے اعلیٰ عہدہ حاصل ہوا۔ اس کی چار خاص وجوہات ہیں۔

یحییٰ خان کی فوجی حکومت کے خلاف غم وغصہ، پاکستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے درمیان جدوجہد، وہ سیاسی سوجھ بوجھ جس کی وجہ سے ملک کے مغربی حصے میں پاکستان پیپلز پارٹی سب سے زیادہ طاقتور پارٹی کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی، جس کا مقصد ملک کے اتحاد کی حفاظت تھا اور بھٹو کی تائید اور حمایت جو نوجوان نسل اور غریب طبقے نے کی۔

بھٹو کی دیگر تمام باتوں کی طرح اس کی مقبولیت بھی ٹھیک اسی طرح کم وبیش ہوتی رہتی ہے جس طرح اس کا مزاج گرم اور ٹھنڈا ہوتا رہتا ہے۔ پاکستان میں ایسے لوگوں کی کافی بڑی تعداد ہے جو بھٹو پر یقین نہیں کرتے۔ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو بھٹو کے خلاف اس لیے ہیں کہ وہ چین کے ساتھ دوستی رکھنے کا زبردست حامی ہے۔ کچھ لوگ اس کے گرم رویئے سے پریشان ہیں۔ بہرحال جب یحییٰ خان کو صدر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تو وہ عہدہ بھٹو نے سنبھالا۔ اس وقت اس کے مقابل کوئی نہ تھا۔

بنگلہ دیش کو کھونے کے تازہ صدمے کے بعد پاکستان میں ایک مرتبہ پھر ویسی ہی سیاسی حالت پیدا ہوگئی ہے جیسی پہلے تھی۔ تین بنیادی باتوں کو لے کر پھر جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ باتیں تھیں مختلف صوبوں میں زبان کے اعتبار سے نمائندگی، صوبوں کی خودمختاری اور یہ سوال کہ پاکستان میں کس طرح کا آئین لاگو کیا جانا چاہیے۔

جہاں تک زبان کا سوال تھا یہ بات قابل غور ہے کہ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی کئی خاص زبانیں ہیں۔ وہ ہیں۔ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور اردو۔ پہلی چار زبانیں صوبائی زبانیں ہیں۔ اردو پاکستان کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہے۔ حالانکہ عام طور پر سبھی لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ تاریخی وجوہات سے یہ ایک طرح سے سرکاری زبان کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے کیونکہ اردو ہمیشہ سے تعلیم یافتہ اور تجارتی طبقے کی زبان رہی ہے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں زبان کا جھگڑا اس قدر نہیں ہے جس قدر سیاسی جھگڑا ہے۔ وہ لوگ اپنی ایک الگ سیاسی شناخت چاہتے ہیں۔ ان کا یہ مطالبہ صرف زبان کی بناء پر ہی نہیں ہے لیکن سندھ میں زبان کے معاملے میں لوگ بہت کٹر ہیں اور شاید بھٹو کے صدر ہونے کے بعد ان کے اس جذبہ میں اور بھی اضافہ ہوا ہے کیونکہ اب ایک سندھی صدر ہے۔

تمام فساد کی جڑ یہی ہے کہ جو مہاجرین اور بے گھر اجڑے ہوئے لوگ ہندوستان سے پاکستان پہنچے وہ زیادہ تر اردو بولتے تھے۔ یہ لوگ کافی بڑی تعداد میں کراچی میں جا کر آباد ہوگئے۔ یہ شہر بہت ہی اہم ہے اور سندھ شہر ہے لیکن کراچی کو ایک خاص درجہ دیا گیا۔ اسے صرف

سندھی شہر ہی نہیں مانا گیا بلکہ اسے ملک کا دارالخلافہ بھی مانا گیا۔ جب اردو پاکستان کی قومی زبان بنی تو اردو بولنے والے خصوصاً کراچی اور اس کی باہری کالونیوں میں ہی آباد تھے۔ سندھ کے اندرونی حصوں میں اردو سے لوگ قطعی طور پر نا آشنا تھے۔

کچھ عرصے تک لوگوں نے اردو کی زیادہ فکر نہ کی۔ لیکن پھر لوگوں کے دلوں میں اردو کو مخصوص درجہ دیئے جانے پر غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے بڑبڑانا شروع کیا کہ اردو غیر ملکی زبان ہے اور پاکستان کا کئی بھی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں کے لوگ صرف اردو ہی بولتے ہوں اور کوئی دوسری زبان نہ بولتے ہوں۔ شہر کراچی ہی ایسا شہر تھا جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کافی تھی لیکن اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی وہ سندھی اکثریت پر قابض تھے۔

اردو کے مخالفین نے اس بات کا اصرار کیا کہ اردو جیسی زبان کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ خاص طور پر اس لیے کہ صرف مٹھی بھر لوگ جن کی تعداد تقریباً تیس لاکھ ہے۔ اردو کے اپنی مادری زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ بھی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اردو کو پنجابیوں، سندھیوں اور دیگر لوگوں پر اس لیے مسلط کیا جارہا ہے کہ پاکستان کی پالیسی طے کرنے والے لوگ شروع میں دلی۔ یو، پی اور ایسے علاقوں کے رہنے والے تھے۔ جہاں اردو بولی جاتی تھی۔

اس کے برخلاف اردو کے حماتیوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اردو کو پاکستان کی موجودہ زبانوں پر لادا نہیں گیا ہے بلکہ قائداعظم محمد علی جناح نے خود ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کو ہی قومی زبان بنایا جائے کیونکہ یہ بے حد مالدار اور دیگر زبانوں کی نسبت زیادہ بہتر ہے۔ اس کے علاوہ یہ پاکستان کے سبھی پانچوں صوبوں میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اگر کسی صوبائی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا جاتا تو دوسرے علاقوں کی زبان بولنے والے اس پر اعتراض کرتے۔

اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ایوب خان پٹھان ہوتے ہوئے بھی اردو سے محبت کرتے تھے۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بنگالیوں کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اس زبان کو قومی اور رابطہ قائم کرنے والی زبان کی حیثیت سے قائم رکھا۔

بنگلہ دیش بننے سے پیشتر اردو کے بعد بنگالی ہی ایک ایسی زبان تھی جو پاکستان کے آدھے سے زیادہ لوگوں کی زبان تھی۔ اس لیے دوسری قومی زبان کا درجہ بنگلہ زبان کو دیا گیا۔ لیکن جب بنگلہ دیش الگ ہوگیا تو اردو کے درجے کو ایک مرتبہ پھر للکارا گیا۔ اس مرتبہ اس کی بناء یہ تھی کہ ہر علاقے کی زبان صوبائی زبان ہونی چاہیے سندھ میں سندھی زبان ہونی چاہیے۔ پنجاب میں پنجابی، شمال مغربی سرحدی صوبے میں پشتو اور بلوچستان میں بلوچی۔ بلوچی زبان کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں ہے۔ اس لیے وہاں لوگ رومن میں لکھتے ہیں۔

تنگ نظری کی اس طرح کی باتوں کے لیے جو جھگڑے ہورہے تھے ان میں بھٹو خود کو پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ ایک دوسرے کا سر پھوڑنے لگیں اس نے زبان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک فارمولہ پیش کیا۔ اس کے تحت اردو قومی زبان کی حیثیت سے بنی رہے گی کیونکہ یہی ایک ایسی زبان ہے جو سبھی علاقوں کے درمیان رابطہ قائم کرنے والی زبان کا کام کرسکتی ہے۔ ہر صوبے کو یہ حق ہوگا کہ وہ کام کاج کے لیے اپنی علاقائی زبان کا استعمال کرے۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد بھٹو نے صرف ایک راستہ جو اس کے سامنے تھا اسی کو اختیار کیا۔ وہ بین الاقوامی اتحاد کا پکا حامی ہے۔ اس لیے اس نے ایک سندھی کے ناطے سے سلوک نہیں کیا بلکہ پاکستان کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس پر اکثر یہ الزام لگائے جاتے رہے ہیں کہ وہ سندھی زبان کی طرف داری کرتا ہے۔

لیکن بھٹو کے لیے زبان کا مسئلہ شاید سب سے معمولی اور چھوٹا مسئلہ تھا اس سے زیادہ خطرناک بات علیحدگی کی خواہش تھی جو بنگلہ دیش

کی کامیاب بغاوت کی وجہ سے ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔

پاکستان کے جتنے صوبے یا ریاستیں ہیں وہ سب اپنے اپنے طریقے سے علیحدہ علیحدہ اور طاقتور صوبائی یونٹ ہیں۔ وہ اپنی علیحدہ ریاست بنائے رکھنے کے لیے قوم کے ساتھ وفاداری کو بھی کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کی سرکار میں حکومت پر پٹھان اقلیت کا پورا پورا قبضہ تھا۔ اس کی پنجابی اور سندھی مسلسل مخالفت کرتے رہے۔ ان دونوں صوبوں کے لوگوں کی تعداد پٹھانوں سے بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح پٹھانوں میں بھی پنجابیوں اور سندھیوں کی سخت مخالفت ہے۔ ان کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر حکومت پر پنجابیوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے اور ایک گوشے میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ جہاں قومی پالیسی طے کرنے میں ان کی بات نہیں سنی جائیگی۔

صدر کی حیثیت سے بھٹو کو پٹھانوں، پنجابیوں اور سندھیوں کی تکونی جدوجہد کو برداشت کرنا پڑا۔ قومی لیڈر کی حیثیت میں ان کا یہ لازمی فرض تھا کہ وہ سب کے ساتھ قومی اتحاد کو خطرے میں ڈالے بغیر انصاف کرے۔

بھٹو پنجابیوں پر پٹھانوں کو حکومت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ پنجابیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح وہ پنجابیوں کو پٹھانوں کا سیاسی اور تجارتی طور پر لہو نہیں چوسنے دے سکتا تھا صرف اس لیے کہ پنجابی تعداد میں زیادہ ہیں۔ بھٹو یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ سندھیوں کی طرف داری کرے، اس طرح کا کام کرنے سے اس کے بارے میں غلط فہمی ہوتی کیونکہ وہ خود سندھی ہے اور اس کو اپنے علاقے میں بہت سے لوگوں کی تائید و تعاون حاصل ہے۔

بھٹو نے تکونی جدوجہد کے مسئلے کو اپنے طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ظاہر ہے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ یکا یک پنجابی اور پٹھان دونوں کسی نہ کسی بہانے اس کے پیچھے پڑے گئے اور اس کی کڑی تنقید کرنیلگے۔ سندھیوں نے حالانکہ اس کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کی لیکن انہوں نے بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کا اس وقت پوری طرح ساتھ نہیں دیا جس وقت اسے ان کے تعاون کی ضرورت تھی بلکہ اس کے برعکس چند سندھی بولنے والوں کو ورغلانا شروع کر دیا کہ نہ تو بھٹو سندھی ہے اور نہ ایوب خان یا یحییٰ خان سندھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی کو سندھ میں کبھی سرکاری زبان کا درجہ نہیں مل سکے گا۔

کچھ دیگر سیاسی پارٹیوں نے بھی بھٹو کی اس پریشانی کا فائدہ اٹھایا اور یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو آزاد کر دیا جائے۔ پٹھانوں اور بلوچیوں نے سمجھا کہ یہ سنہری موقع ہے۔ ولی خان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیڈروں نے بھٹو کے خلاف من مانے الزام لگائے اور یہ بھی کہا کہ وہ غدار ہے۔ اسے بنگلہ دیش کی شکست کے لیے ذمہ دار بتایا اور یہ پروپیگنڈا کیا کہ جنگی قیدیوں کی رہائی میں ناکامی کا قصور بھی بھٹو کا ہی ہے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے مطالبات کے بارے میں بھٹو اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ کوئی کاروائی کر سکتا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ آئین میں ایسی کوئی دفعہ نہیں تھی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے لوگوں کی خود مختار ریاست بنا دی جائے اور دوسرے یہ معاملہ کافی حد تک ظاہر کرتا تھا کہ جو مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ مکمل آزادی کا مطالبہ ہے۔ حالانکہ آزادی کا یہ مطالبہ بالکل صاف الفاظ مین نہیں کیا گیا تھا لیکن اس بات کی معقول وجوہات موجود ہیں کہ جو اندیشہ کیا جا رہا تھا وہ کافی حد تک درست تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیڈر ولی خان نیشنل عوامی پارٹی کے صدر ہیں۔ وہ خان عبدالغفار خان کے صاحبزادے ہیں جو بہت دنوں سے آزاد پختونستان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے حال ہی مین بیان دیا تھا کہ اگر شمال مغربی سرحدی صوبے کا نام بدل کر پختونسان کر دیا جائے تو اسی سے انہیں تسلی ہو جائیگی۔

بنگلہ دیش بن جانے پر پاکستان کی قومی خودداری کو کافی صدمہ پہنچ چکا ہے۔ ایسی حالت میں بھٹو کے لیے یہ قدرتی ہے کہ وہ ولی خان

اور زیادہ خودمختاری کے مطالبے کو شک کی نظر سے دیکھے اور یہ سمجھے کہ اس مطالبے کے معنی مکمل آزادی حاصل کرنا ہے اور آخر میں پختونستان پاکستان سے علیحدہ ہو جائیگا۔

پاکستان میں اس وقت کافی اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔ ہر مورچے پر جھگڑا چل رہا ہے۔ مثال کے لیے اس بات پر بھی کافی بحث چل رہی ہے کہ ٹوٹی ہوئی ریاست کی یہ سرکار کس طرح چل سکے گی۔

بھٹو صدارتی طرز کی سرکار چاہتا تھا۔ بلوچی اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیڈران اس حق میں تھے کہ پارلیمانی طریقہ اختیار کیا جائے۔ بھٹو کی پارٹی میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اس حق میں ہیں۔ بھٹو کی وزارت کے ساتھی وزیر قانون قصوری نے جو استعفیٰ دیا اس کے نتائج کا اثر دور تک پڑا۔ قصوری نے خاص طور سے اسی بات پر استعفیٰ دیا تھا کہ وہ بھٹو کی خواہش کے خلاف پارلیمانی سسٹم کے حامی ہیں۔

ادھر بھٹو نے ہندوستان کا جو سفر کیا اور شملہ سمجھوتے پر دستخط کئے اس سے جماعت اسلامی کو بھٹو کے خلاف ایک نئی تحریک چھڑ دینے کا موقع مل گیا۔ جماعت اسلامی نے الزام تراشا کہ بھٹو کشمیر ہندوستان کو دے رہا ہے۔ وہ کمیونسٹ ہے لہٰذا خدا اور مذہب کو نہیں مانتا۔

اس طرح کے بدنیتی بھرے الزاموں کا جواب پاکستان پیپلز پارٹی نے ولی خان پر یہ الزام لگا کر دیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ لندن میں ملاقات کرنے کے بعد ان کے اشارے پر ولی خان نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستانی کی مکمل آزادی کے مطالبے پر زور دیں گے۔

اس صورت حال میں جنرل ٹکہ خان کو بھی گھسیٹ کر بحث مباحثے کا موضوع بنا دیا گیا۔ تمام پاکستان میں اس مقصد کے لیے پوسٹر چسپاں کر دیئے گئے۔ جن میں دعویٰ کیا گیا کہ ایک ایماندار فوجی آمریت لاکھ درجہ بہتر ہے ایک غیر فوجی بدعمل آمریت سے۔ ٹکہ خان کے پاس بے شمار خط بھیجے گئے۔ جن ان سے کہا گیا کہ وہ بھٹو کے ہاتھوں سے حکومت کی باگ ڈور لے لیں۔

یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس معاملے میں ٹکہ خان نے کیا رول ادا کیا۔ یہ پتہ نہیں کہ ٹکہ خان نے اس تحریک کو بڑھاوا دیا یا نہیں۔ ابھی تک اس طرح کا ثبوت نہیں ہے کہ ٹکہ خان کا اس تحریک میں کوئی ہاتھ ہے یا نہیں۔ اس لیے زیادہ یہی ممکن ہے کہ یہ تحریک جماعت اسلامی اور بھٹو کے مخالفین نے شروع کی۔ ٹکہ خان کو اس کی کوئی جانکاری نہیں دی گئی۔

بھٹو نے فوراً محسوس کر لیا کہ پارلیمانی سسٹم کا جو مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے پس پردہ کیا بات ہے۔ پاکستان کو اس وقت ایک ایسے فولادی شخص کی ضرورت ہے جو صدر کی حیثیت سے ان مختلف مسائل کو فوراً حل کر دے جن کو فوراً حل کیا جانا ضروری ہے لیکن بھٹو اپنے مخالفین کو پوری طاقت سے جواب دینے کی حیثیت میں نہیں تھا کیونکہ اس کی اپنی ہی پارٹی میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ ایک دھڑا جس کی رہنمائی بھٹو کی وزارت کے ساتھی نیاز محمد کر رہے ہیں وہ بھٹو سے اس لیے ناخوش تھا کہ اسے صدر کی لیبر پالیسی پسند نہ آئی تھی اور بھی بہت سے ممبر پاکستان پیپلز پارٹی چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی پارٹیوں اور دھڑوں میں جا کر مل گئے۔

بھٹو پر اس وقت دباؤ اور بھی زیادہ بڑھ گیا جب سابق ائیر مارشل اصغر خان اکھاڑے میں کود پڑے اور انہوں نے بھٹو کو غدار کہنا شروع کر دیا۔ چند دن پہلے پاکستان کے ایک اخبار میں اصغر خان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اصغر خان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بنگلہ دیش کی شکست کے لیے بھٹو ہی ذمہ دار ہے۔ اصغر خان نے بھٹو پر یحییٰ خان کو دھوکے میں ڈالنے کا الزام لگایا۔ اصغر خان نے لکھا کہ

> ''بھٹو نے یحییٰ خان کو غلط اطلاع دی کیونکہ بھٹو نے نیویارک سے ایک بحری تار کے ذریعے یحییٰ خان کو یہ خبر بھیجی تھی کہ امریکہ نے ہندوستان پاکستان کے جھگڑے میں دخل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے

اور ساتواں بیڑا خلیج بنگال کی طرف بڑھ رہا ہے تا کہ ہندوستان کے حملے کو روکا جا سکے۔ بھٹو کے
مشوروں پر عمل کر کے یحیٰی خان نے لیفٹیننٹ جنرل راؤ فرمان علی کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار نہ ڈالیں۔
کیونکہ امریکن امداد پہنچ رہی ہے۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے بنگلہ دیش میں فوجی ناکامی کے
لیے یحیٰی خان ذمہ دار نہیں تھا بلکہ بھٹو پر ہی اس فوجی ناکامی کی پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے"

شملہ سمجھوتے پر دستخط ہو جانے کے بعد مخالف پارٹیوں کو تنقید کے لیے اور بھی مصالحہ مل گیا۔ انہوں نے اس سمجھوتے کو پاکستان کا بکری نامہ بتا دیا اور کہا کہ اب پاکستان مکمل طور پر ہندوستان کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہ الزام بھی بار بار تراشے گئے کہ ایک خفیہ سمجھوتا ہوا ہے جس کے مطاب کشمیر کا جو حصہ پاکستان کے پاس ہے وہ ہندوستان کو واپس دے دیا جائیگا۔

اگر حالت عام دنوں جیسی ہوتی تو بھٹو نے اس طرح کے بدنام کرنے والے الزامات کا جواب کوئی بڑی کاروائی کر کے دے دیا ہوتا۔ لیکن بدبختی سے وہ ابھی تک جنگی قیدیوں کے مسئلے کو حل نہیں کر پایا ہے۔ اس سے اس کے مخالفین کو اس پر کمزور لیڈر ہونے کا الزام لگانے کا موقع مل گیا ہے۔

اس طرح پاکستان ایک آئینی دشواری مین سے گزر رہا ہے۔ قومی اسمبلی میں پنجابیوں کی اکثریت ہے۔ اس سے سندھی، بلوچی اور پٹھان سب ہی خوفزدہ ہیں۔ ان سب نے مل کر یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا ہے کہ ان کے مفاد کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ اسی سلسلے میں یہ جھگڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ پاکستانی سرکار کی مستقبل میں کیا شکل ہونی چاہیے۔ مخالف پارٹیاں چاہتی ہیں کہ پارلیمانی سسٹم ہو۔ ان کے مطابق پارلیمنٹ بھٹو کی بے انسافی سے بھری حرکتوں سے ان سب کی حفاظت کر سکتی ہے۔ ایسے اہم اور نازک دور میں بھٹو کے کچھ دوستوں اور ساتھیوں نے مخالف نظریئے کی حمایت کرنی شروع کر دی ہے۔ محمود علی قصوری کے استعفیٰ سے معاملہ اور بھی بگڑ گیا۔

مخالف پارٹیوں کے مطابق بھتو پارلیمانی سسٹم کے خلاف ہے کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے اس کے حقوق میں کمی آجائے یگی اور اس ے اپنے پینترے دکھانے کا پورا پورا موقع نہیں حاصل ہو سکے گا۔

جب بھٹو کے خلاف تحریک اپنی بلندی پر تھی تو بھٹو اس پورے عرصے میں مختلف سیاسی پارٹیوں سے محو گفتگو رہا۔ جس سے کہ کوئی مناسب حل تلاش کیا جا سکے اور یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ جب اسے سیاسی لیڈروں کی طرف سے یہ بھروسہ ہو گیا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ بھٹو صدارت سے برطرف ہو جائیں۔ بلکہ ان کی یہ زبردست خواہش ہے کہ پاکستان میں ایک ایسی مضبوط سرکار قائم ہو جسے عوام کے نمائندوں کی پوری پوری حمایت حاصل ہو۔ بھٹو خود اس بات پر رضامند ہو گیا اور اس نے وعدہ دے دیا کہ نیا آئین 23 مارچ 1973ء تک تیار ہو جائے گا اور وہ مذہب اسلام پر مبنی ہوگا۔ اس آئین کے ذریعے پاکستان میں پارلیمانی سسٹم کے تحت سرکار قائم کی جائیگی۔

شملہ سمجھوتے کے بعد بھٹو کی سیاسی زندگی کا یہ قومی سمجھوتہ دوسرا سب سے بڑا حصول تھا۔ ایک ہی فیصلے سے اس نے تمام مخالف پارٹیوں کے منہ بند کر دیئے۔ دشمنوں کو اپنا حامی بنا لیا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کا اتحاد محفوظ کر دیا۔ عام طور سے اس وقت جب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان کے اندر ہی اندر جدوجہد کا ایک اور نیا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

بیسواں باب

کیا زلفی کامیاب ہو پائے گا؟

اگر پاکستان اور ہندوستان اسلحہ حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں تو میرا پختہ یقین ہے کہ نہ تو ہندوستان کا اور نہ پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس معاملے میں ہر فریق یہ محسوس کرتا ہے کہ اس دوڑ کے لیے دوسرا ذمہ دار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے درمیان دشمنی کے رویے میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا جلتی پر تیل کا کام کر رہا ہے۔ اس سے ایک دوسرے پر شک کی جڑیں اور زیادہ گہری ہوگئی ہیں۔ لیکن اصل جھگڑے کی جڑ کشمیر ہے۔ اس مسئلے کے حل پر ہی دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کی کچھ نہ کچھ بات تو سمجھنی ہی ہوگی۔ تاریخ اور حقائق کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ خیال بھی رکھنا پڑے گا کہ جب بھی اس مسئلے کا ذکر آتا ہے دونوں ملکوں کے جذبات تیزی سے ابھرنے لگتے ہیں۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ 14 اگست 1974ء کو کسی بھی ہندوستانی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ بنے گا اور نہ کسی پاکستانی کو خواب میں بھی یہ اندازہ تھا کہ کشمیر ہندوستان میں شامل ہو جائے گا اور پھر ہندوستان کا ایک حصہ بن جائے گا۔ اسی بناء پر ملک کی تقسیم کی گئی۔ کسی بھی طور میں اس کا ذکر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو لیکن یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ہندوستان کی دیسی ریاستیں ہندوستان یا پاکستان دونوں میں سے کسی بھی ملک میں شامل ہو جائیں گی اور یہ اس بات پر منحصر ہوگا کہ ریاست میں کس مذہب کے لوگ زیادہ تعداد میں ہیں۔ تقسیم کے لیے مسلم اور غیر مسلم علاقوں کی بناء طے کی گئی تھی۔ سمجھوتے زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور منجھے ہوئے الفاظ میں کئے جا سکتے ہیں لیکن تقسیم کی بناء یہی تھی۔ اس کے بعد دونوں طرف سے بڑی غلطیاں ہوئیں۔ نہ صرف کشمیر میں بلکہ دیگر علاقوں میں بھی۔ مثال کے طور پر جونا گڑھ اور حیدآباد میں ہندوستان نے حالت خوشگوار بنالی لیکن کشمیر میں پاکستان کو ایسا کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ کشمیر اپنی رضامندی کے تحت ہندوستان میں شامل ہوا تھا۔ اس کے باوجود کشمیر کا ایک حصہ تک پاکستان میں ہے اور اس کا صرف ایک ہی حصہ ہندوستان میں شامل ہو سکا ہے۔ مسلح جدوجہد کے باوجود یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا اور جنگ بندی تسلیم کر کے، اس سوال کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے پاکستان کے دل میں یہ جذبہ بنا رہتا قدرتی ہے کہ تقسیم کے وقت اسے ٹھگا گیا ہے اور ہندوستان کا یہ سوچنا قدرتی ہے کہ شامل ہونے کے دستاویز پر دستخط ہو جانے کے باوجود ہندوستان پورے کشمیر پر قبضہ نہیں پا سکا۔ یہ دونوں باتیں تاریخی سچائیاں ہیں اور تاریخ کو مٹانا ناممکن نہیں ہے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح انڈے کو توڑ دینے کے بعد اسے جوڑنا ناممکن نہیں ہے۔ اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ کشمیر کے مسئلے کو میرے فارمولے کے تحت حل کیا جا سکتا ہے اور میرا فارمولہ اس طرح ہے۔

1۔ دونوں فریقوں کو یقینی طور پر یہ محسوس کرنا چاہیے کہ امن قائم کئے بغیر ان کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ دونوں فریقوں کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اسلحہ کو حاصل کرنے کی دوڑ دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے دونوں کو یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ ہند پاک میں امن قائم کرنے کا دونوں نے پکا تہیہ کر لیا ہے۔

2۔ دونوں فریقوں کو بڑی نرمی سے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کی نسل کشمیر کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتی، اس لئے اس مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری آنے والی نسل کو سونپ دینی چاہیے۔

3۔ کوئی بھی فریق اپنے ملک کے عوام کا یقین نہیں کھو سکتا۔ اس لیے دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو یہ مانتے رہنا چاہیے کہ کشمیر اس کا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ دوسرے فریق کو بھی ایسا ہی دعویٰ کرنے کا حق ہے۔

4۔ دونوں فریقوں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ امن کے ساتھ دوستوں کی طرح رہنے کی ضرورت بھی ہے اور اہمیت بھی ہے۔اس لیے انہیں طے کر لینے چاہیے کہ کسی بھی طرح جھگڑا پیدا ہونے پر وہ مسلح جنگ کا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔

5۔ دونوں فریق اس سچائی کو تسلیم کرنے کا اعلان کریں کہ کشمیر میں کنٹرول لائن ہے۔اس کنٹرول لائن کے اس پار یا اس پار جو بھی علاقہ جس ملک کے قبضے میں ہے۔اسے وہاں امن وامان بنائے رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

6۔ دونوں فریقوں کو اپنے فوجی دستے ایسی چوکیوں پر سے ہٹا لینے چاہئیں جس سے جھگڑے کی حالت پیدا ہوتی ہو۔ان فوجی دستوں کو بیرکوں میں واپس بھیج دینا چاہیے۔ جہاں عام طور سے وہ رہتے ہیں۔

7۔ جس فریق کے قبضے میں جو علاقہ ہے وہاں امن وامان بنائے رکھنے کے لیے پولیس کا انتظام کرنا اس فریق کی ذمہ داری ہے۔

8۔ تناؤ کم کرنے کے لیے دونوں فریقوں کو سرحد پر برتی جانے والی سختی کم کر دینی چاہیے۔اور سرحد کی لائن کے دونوں طرف کے لوگوں کو کھلے طور پر تجارت کرنیکی اجازت دینی چاہیے۔

آخر بات سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس میں آئندہ ہونے والے سمجھوتے کا بیج پنہاں ہے۔

کشمیر اور ہندوستانی کشمیر کے درمیان جب لوگوں کی آمد ورفت آسانی سے شروع ہو جائے گی اور تجارت سے دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچے گا اور مستقبل میں بہت زیادہ منافع ہونے والی تجارت کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور جب عام دنوں جیسا پر امن رابطہ پوری طرح قائم ہو جائیگا تو کشمیر کا مسئلہ بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔اس سے ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں میں غصہ اور فکر پیدا نہیں ہوگی۔

اس طرح کا انتظام ہو جانے کے بعد کیا ہوگا۔اس کی بابت زیادہ اندیشوں کو دل ودماغ میں جگہ دینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔دونوں میں سے ہر فریق ایک دوسرے کے یہاں دراندازبھیج سکتا ہے۔لیکن وہ وہاں جا کر عوام کو کس طرح بھڑکائیں گے؟ان سے کیا وعدے کریں گے؟میں ایک صورت حال کا تخیل کرتا ہوں، جب کشمیر کے متعلق کوئی جھگڑا ہوگا ہی نہیں اور نہ لوگ اس کے متعلق فضول کی باتیں کریں گے۔تب کشمیر پر زہریلا اور جھگڑے پیدا کرنے والا پروپیگنڈا بھی نہیں کیا جا سکے گا۔

دراصل میں اس معاملے میں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہتا ہوں اور یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ پوری بین الاقوامی سرح کو کھلا دینا چاہیے۔کیونکہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان رہتے ہیں اور وہ پاکستان کے ساتھ دوستی چاہتے ہیں۔جس سے ان کے دل ودماغ میں سلامتی کا جذبہ پختہ ہوتا جائے حقیقی طور پر یہ ان ہزاروں خاندانوں کا مسئلہ ہے جن کے رشتے دار اور دوست سرحد کے ادھر یا ادھر رہتے ہیں۔بین الاقوامی سرحد کو پار کرنے کی سخت پابندیوں کو ہٹا دینے سے وہ اپنے گھرانے کے لوگوں سے مل سکیں گے اور آمد ورفت پر کسی طرح کی پابندی نہ ہونے پر وہ جتنی بھی مرتبہ چاہیں گے آجا سکیں گے۔

اگر میرا یہ حل ہندوستان کو منظور ہو تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان بھی رضامند ہو جائیگا۔اس طرح کا اشارہ بھٹو نے اس انٹرویو میں دیا ہے جو انہوں نے اسٹیٹس مین کے دیدیڈنٹ ایڈیٹر کلدیپ نیر کو دیا تھا۔بھٹو نے کہا تھا کہ میں ہندوستان کے ساتھ امن کی شروعاتی بات چیت میں 25 سال پرانے کشمیر کے مسئلے کو گھسیٹ کر نہیں لے جاؤں گا۔ہم جنگ بندی لائنکو شروعاتی امن کی بنیاد تسلیم کر سکتے ہیں۔کشمیری عوام کو دونوں ملکوں میں آمد ورفت کی مکمل آزادی اور پورا حق ہونا چاہیے۔اس کے بعد ایک کے ساتھ دوسری بات طے ہوتی جائے گی۔ مجھے اور شریمتی گاندھی کو آج ہی ہر بات کیوں طے کر لینی چاہیے! ہمیں صحیح سمت میں چیزوں کو آگے بڑھانا چاہیے۔دوسرے لوگ ان سمتوں کی طرف بڑھ سکتے ہیں اس سب کانٹی نینٹ کے تمام سوال ایک بارگی حل نہیں کیے جا سکتے۔

تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے جب کہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ مسئلے دونوں فریقوں کی نیت نیک ہونے کی وجہ سے حل ہو گئے۔

اگر صرف ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش اپنے مشترکہ مفاد کے لیے اپنے اختلافات دور کر دیتے ہیں تو جنوبی ایشیاء کا یہ پورا علاقہ بن جائے گا۔ جس میں سبھی ایک دوسرے کی عزت کریں گے۔ سلامتی کا انتظام مشترکہ ہوگا۔ ان کو اذاتی مشترکہ ہوگا۔ ان کا ذاتی مشترکہ بازار ہوگا۔ ایسا انتظام ہو جانے سے سلامتی کا بجٹ بھی کافی کم کیا جا سکے گا اور اس طرح جو رقم بچے گی وہ ان ملکوں کے ترقیاتی کاموں پر بڑی کامیابی کے ساتھ خرچ کی جا سکے گی۔ تجارت اور امداد کے ذریعے دوسرے ممالک ہندوستان اور پاکستان کے گھریلو معاملوں میں جو دخل اندازی کرتے ہیں اسے مضبوط دوستی اور دانشمندی سے آسانی سے روکا جا سکتا ہے۔

اگر ہم خود کو صرف خود کفیل بنا سکیں تو اس علاقے میں بڑی طاقتوں کی دست درازی رک جائے گی۔ اگر جنوب مشرقی ایشیا میں یہ ابتدا ہو جائے تو ہم افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کے درمیان اس طریقے کو اختیار کر سکتے ہیں۔ خاص طور سے بحر ہند کی ریاستوں کے معاملے میں تو یہ لائحہ عمل ایک ایسی مضبوط چٹان ہے جس کی بنیاد پر تیسری دنیا کے ملک اپنی عظمت اور اپنی قسمت کو تعمیر کر سکتے ہیں۔

اب تک ان تینوں ملکوں کو پتہ چل چکا ہوگا کہ تجارتی منڈیوں کی رقابت سے جنسوں کی منڈیوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دولت مند ملکوں کے ساتھ خواہ تجارت کی جائے یا ان سے امداد لی جائے دونوں ہی صورتوں میں ترقی کرنے والے ملکوں کے ساتھ خواہ تجارت کی جائے یا ان سے امداد لی جائے دونوں ہی صورتوں میں ترقی کرنے والے ملکوں کا درجہ گھٹتا ہے۔ ان کی خود اعتمادی غائب ہو جاتی ہے اور وہ اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ایک مقررہ وقت کے بعد انہیں اپنی کرنسی کی قیمت کم کرنی پڑتی ہے اور مالدار ملکوں پر دہ سے زیادہ سے زیادہ منحصر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی میں جتنا فرق ہوگا اتنا ہی فرق مختلف ملکوں کے درمیان ہوگا۔ اگر کوئی اکیلا ملک کھلے بازار میں ٹیکنالوجی خریدے تو وہ بہت مہنگی پڑے گی لیکن اگر مشترکہ طور پر خریدی جائے تو وہ نسبتاً سستی قیمت پر سبھی کو دستیاب ہو سکے گی۔ موجودہ انڈسٹری کا پھیلاؤ نیم ترقی یافتہ ملکوں کی مالی حالت پر منحصر ہوتا ہے۔ تیم ترقی یافتہ ملکوں کی منڈیاں بے شک بہت بڑی ہیں لیکن وہاں کے لوگوں کی خریداری کی طاقت کم ہونے کی وجہ سے ان سے فائدہ نہیں ہوتا۔

اگر یہ منڈیاں مشترکہ بازار کا حصہ بن جاتی ہیں تو اس سے گھریلو قیمتیں ٹھہر جائیں گی۔ اور باہر سے جو ناجائز تجارت ہوتی ہے وہ ختم ہو جائیگی۔

قومی سلامتی کے معاملے میں بھی یہ معمولی سی سمجھ کی بات ہے کہ جو ملک پڑوسی دوست ملکوں سے گھرا ہوا ہوگا، وہ اپنے عوام کے رہن سہن کے معیار کو ضرور بلند کر سکے گا اور اس طرح لوگوں کو سکون و آرام مہیا کر سکے گا۔

اگر پاکستان کے صدر جناب ذوالفقار علی بھٹو ان چیلنجز کو سمجھتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے چاق و چوبند ہو کر کام کریں گے تو تاریخ میں انہیں نئی دنیا کے ہیرو کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اس کے برخلاف اگر وہ حکومت کے لالچ میں پڑ جاتے ہیں۔۔۔ لوگوں کو لالچ دے کر ان پر فتح پانے کی کوشش کرتے ہیں اور گدلی بین الاقوامی سیاست کے چکر میں آ جاتے ہیں جیسا کہان سے پہلے کے لوگوں نے کیا۔

اگر وہ ہمیشہ اپنی کرسی سلامت رکھنے کی فکر میں ہی رہتے ہیں،۔۔۔۔۔۔ ملک کو ہمیشہ خطرے کے نشانے پر رکھتے ہیں اور اپنے ملک

کی خارجہ پالیسی کو ہندوستان سے نفرت کی بناء پر طے کرتے ہیں۔۔۔تو وہ ایک عظیم موقعے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ان سے پہلے کے پاکستانی صدر وں کا ہوا ہے۔

کیا بھٹو ان چیلینجز کو قبول کر سکیگا۔۔۔۔۔۔؟

مجھے امید ہے کہ میرا دوست زلفی یسا کر سکے گا۔